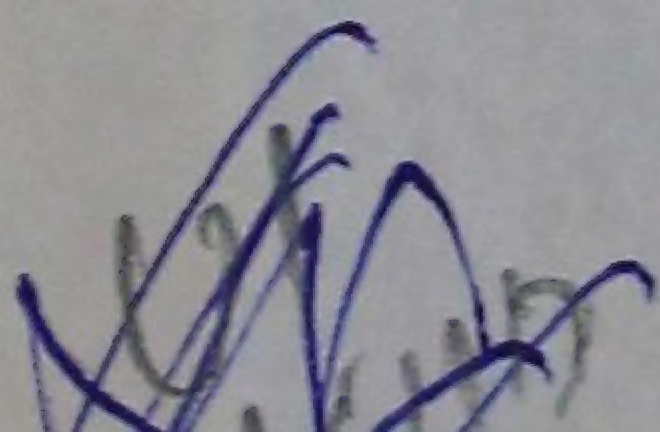
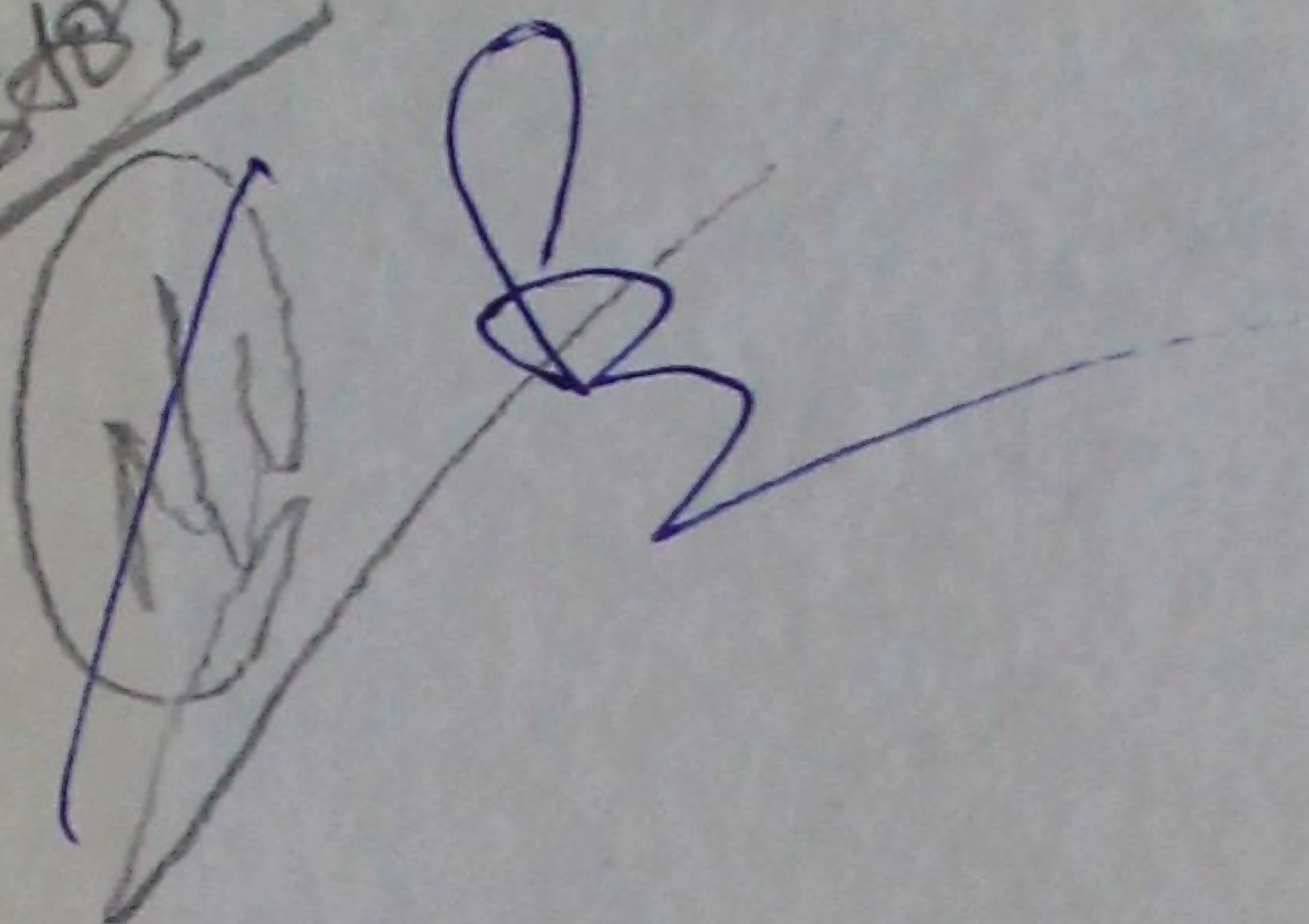


Set 2





57

500

100

100







✓ 6/2/15

# دیوان بقا

ذخیرہ اشپنگر

مع مقدمہ

از

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی



سلسلہ اشاعتِ مخطوطاتِ اردو

دیوانِ بقا

شائع کردہ شعبہٴ اردو دہلی یونیورسٹی

قیمت ساڑھے تین روپے

ریونین پرنٹنگ پریس دہلی

✓  
۱۱  
ب ۲۲۹ د

حسین

CHECKED



ALLAMA IQBAL LIBRARY



98494

ST 01

K UNIVERSITY LIB.

Acc No 98494  
Date ..... 12 ..... 2 ..... 73



## فهرست عناوانات دیوان بفتا

مقدمه	۱
غزلیات	۱
رباعیات و قطعات	۵۵
قصائد	۶۱
هجویات	۷۶
فارسی کلام	۸۵



كتاب الاربعة عشر

في الفقه

الحنفية

ب

الشيخ

الشيخ



## مقدمہ

میر کی ہجو میں بقا کے یہ دو شعر بہت مشہور ہیں :  
 میر نے تو ترا مضمون دو آجے کا لیا      پر بقا تو یہ دعا کر جو دعا دینی ہو  
 یا خدا میر کے دیدوں کو دو آجے کرے      اور بینی یہ بہا اس کی کہ تر بینی ہو  
 بقا صرف میر ہی کے حریف نہیں، سودا کے بھی تھے۔ اُن کے ان معرکوں کا  
 آپ حیات کے علاوہ تقریباً تمام تذکروں میں درج ہے۔  
 گار ساں دتا سی نے لکھا ہے :

”محمد بقاء اللہ تخلص بقا، حافظ لطف اللہ کے بیٹے تھے۔ ان کی ولادت اکبر آباد  
 (آگرہ) میں ہوئی لیکن نوجوانی میں لکھنؤ آکر رہنے لگے تھے۔ ان کا خط بہت پاکیزہ  
 تھا۔ مشرق کے لوگوں میں اس فن کی ہمارت بہت پسند کی جاتی ہے۔ اشعار بھی  
 اچھے کہتے تھے، دہلی میں وہ ابتداءً غمیں تخلص کرتے تھے۔ بعد میں شاہ حاتم کے کہنے  
 پر بقا اختیار کیا۔ وہ حاتم، میر درد اور خصوصیت کے ساتھ میر فاخر ملکین کے شاگرد  
 تھے۔ مصحفی سے ان کے گہرے مراسم تھے جن کے پاس وہ دہلی میں اکثر جایا کرتے  
 تھے۔ مصحفی کا بیان ہے کہ وہ خلیق، ظریف اور قانع جوان تھے جیسا کہ مذہبی لوگ  
 ہوتے ہیں۔ ان کی طبع شوخ ہجو کی طرف مائل تھی۔ اسی وجہ سے دہلی میں ان کے



تیسرے اور لکھنؤ میں سودا سے معرکے ہوئے۔ لطف کا بیان ہے کہ بقا کا انتقال کر بلائے معلیٰ اور نجف اشرف کی زیارت کے دوران میں ہوا۔ یہ سفر انھوں نے ۱۲۰۶ھ (مطابق ۱۷۹۱ء) میں کیا تھا۔ انھوں نے ایک دیوان چھوڑا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے۔

فاخر مکین جن کا ذکر ادب پر آیا ہے، غرور کی وجہ سے اپنے آپ کو شمالی ہندوستان کے معروف شاعر علی حزیں سے بہتر سمجھتے تھے۔ مؤخر الذکر مسلمانوں میں اپنے زہد کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کی خود نوشت سوانح کا ترجمہ مسٹر بلفور نے کیا ہے۔ فاخر نے حزیں کے اشعار میں اصلاح دینے کی جسارت کی۔ اس پر سودا نے جو ہندوستان کے JUVENAL ہیں ان کی ہجو لکھی ہے۔

سعادت خاں ناصر صاحب تذکرہ خوش معرکہ زیبائے بقا پر سودا کی اہانت کا الزام لگایا ہے:

شیخ بقاء اللہ تخلص بقا پر حافظ لطف اللہ خوش نویس اکبر آبادی۔ پیشتر غمیں تخلص قرار دیا تھا۔ جب شاگرد شاہ حاتم کا ہوا، بقا تخلص کیا۔ حاتم کے شاگرد تمام رفیع سودا سے رجوع لائے مگر بقا کہ نام حاتم کا اوتے بقا رہا منکر سودا غائب و حاضر بلکہ اہانت سودا کی اوس کے کلام سے ظاہر اور میر تقی میر سے بھی ناصاف، غلطی کا اوس کی اعتراف، ہر دو بزرگوار کی مذمت سے آلودہ اور خامہ صفحہ ہجو پر فرسودہ رکھتا تھا۔ آخر عمر میں وحشت نے اوس کی طبع پر راہ پائی، دیوان کو اپنے اوسکی مکافات میں کہ بہت سے پردہ ناموس پارہ کیے تھے کاغذ مشکوک کی طرح پارہ کیا۔ چند شعر اوس کے کہ احباب کی بیاضوں میں رقم تھے جمع ہوئے۔



حکایت : بعد کم ہونے ادس وحشت کے عازم بیت اللہ کا ہوا، اسباب خانہ مع  
 زمین چار سو روپیہ کو بیچا اور اس کا غلہ خرید کر کے کشتی میں بھریا <sup>۱۵</sup>  
 مفتی صدر الدین آزرودہ نے اپنے تذکرے میں بقا کا ذکر کیا ہے لیکن اس  
 کوئی خاص بات نہیں۔ احد علی یکتا نے دستور الفصاحت میں ان کی شان پر  
 قصیدہ خوانی کی ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے ریختہ کو فارسی کا اوج بخشا :  
 ”ششم از طبقہ ثانی، تہمتن میدان سخنوری، اسفندیار معرکہ شاعری، بقا اللہ خاں  
 بقا است، کہ بقوت صفائی و فصاحت الفاظ، حفیض ریختہ را باوج فارسی  
 رسانده، و بتوانائی بلاغت و متانت کلام، ادہم ہندی را با شہب عربی دو اندہ۔  
 شاعر قصیدہ گو گذشتہ، ہذا بمقابلہ مرزا محمد رفیع، در قصاید جوابش داد معنی یابی و  
 تشابہ غریبہ دادہ۔ از متاخرین کسی ہمتراز دے او نبود۔ آخر آخر دماغش مغل گردیدہ  
 دیوان خود را مع ہمہ مسود ہائے کلام خود، پارہ نمودہ (۲۰۸ الف) باب ترکردہ،  
 در سبوحہ کلان میداشت ہر کسے کہ طالب شعرش می آمد، ہماں سبوحہ نشاں دادہ  
 میگفت کہ ”دریں ہمہ کلیات من است۔ ہرچہ منظور باشد، بنویسد۔ اما، جو ہائے  
 بعض کساں کہ کردہ ام براے خدا ننویسد کہ من توبہ کردہ ام“ و چوں آخر شوق زیارت  
 حضرت اباعبداللہ الحسین علیہ السلام دامنگیر شد، و از فرط غیرت، کہ مخمطینتش بودہ،  
 نمی خواست کہ دست سوال پیش کس دراز کند یا اعانت زاد راہ جوید، ارادہ نمودہ کہ  
 دوسہ حرفہ خود بیا موزد؛ تا در اں بقعہ مبارکہ روزی حلال بکسب دست حاصل نمودہ  
 خوردہ باشد۔ چنانچہ کندن عقیق و نوشتن خط نستعلیق و نسخ و علم طب در ہماں

<sup>۱۵</sup> سعادت خاں ناصر: خوش معرکہ زیبا قلمی۔ مخرونہ لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری ورق ۳۱ ب  
<sup>۱۶</sup> تذکرہ صدر الدین آزرودہ قلمی ص ۷، کیمبرج۔ عکس ملوکہ راقم



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ  
الحمد لله رب العالمين



اُمّ القادہ در شاہجہاں آباد بامیر و در لکھنؤ بامرزا معرکہ گیر ہوا کردہ و وقت طبع خود را  
ظاہر نمودہ۔ حالہ در لکھنؤ بکنج قناعت پاشکستہ اوقات بیری می کند۔ بانقیر گاہ گاہے  
ملاقات می شود۔

بقا کے تعلقات میحسن سے بھی تھے۔ ان کے ساتھ بھی صحبتیں گرم رہتی تھیں اور  
وہ بھی اُن کے "خوش فکر و خوش اندیشہ" ہونے کے مقرر تھے۔ تذکرہ شعراے اردو میں  
لکھتے ہیں :

”بقا۔ غنچہ بوستان وفا، سر و موزون باغ صفا، شیخ بقا اللہ خاں المتخلص بہ بقا  
ابن حافظ لطف اللہ کہ در لکھنؤ مشہور اند۔ جو انے ست بہ کمال خوبی خوش فکر و  
خوش اندیشہ، در شعر فارسی از شاگردان میرزا فاخر مکیں سلمہ اللہ تعالیٰ لیکن  
شوق ریختہ نیر دارد۔ بانقیر صحبت ہا گرم داشتہ است خدا سلامت دارد۔“  
میر قدرت اللہ قاسم نے بقا کی گرم گفتاری، شوخ طبعی اور ظریف نہادی کا  
ذکر کیا ہے۔ مجموعہ نغز میں لکھتے ہیں :

”بقا تخلص، محمد بقا، اللہ فرزند ارجمند حافظ لطف اللہ خوش نویس کبر آبادی  
است۔ شعر فارسی بہ اصلاح مرزا محمد فاخر مکیں رسانیدہ و اشعار ریختہ از نظر  
استاد اکثرے از سخن سنجان عالم شیخ ظہور الدین حاتم گزرایندہ بہر دوزبان  
اگرچہ گرم گفتار است اما میلش بر ریختہ گوئی بسیار است۔ رخس شوخ طبعی و  
ظریف نہادی می پوید بہجو ہر کس بے ہابا (کذا) مبادرۃ می جوید با سر آمد  
شعراے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا و سخن سنج بے نظیر محمد تقی میر طرف شد  
[تخطیہ نمودہ] بہجو ایشاں پر داختہ سراے کردار ناہنجار [ایں] عزیزان



بواجبی در [کنار] نہادہ زبانِ زوِ خاص و عام ساختہ کہ مرزا بہجو کس بے ہیچ  
 خیلے دلیر بودہ و از دستِ تیر با ایں ہمہ قابلیت عنان جوہر [قابلِ شنا] سی  
 [کبر] خود سریش در بودہ۔ قصہ مختصر محمد بقاء اللہ اگرچہ گرد مضامین قدما  
 میگرد۔ اما بغایت درست فکر، خوشگو، شیریں گفتار، معانی جو است <sup>۱</sup>۔  
 قاسم کی طرح سرور نے بھی بقا کے کلام کی تعریف کی ہے۔ عمدہ منتخب میں  
 لکھتے ہیں :

بقا تخلص۔ محمد بقاء اللہ، خلف حافظ لطف اللہ خوش نویس، شاگرد میرزا  
 محمد فاخر مکیں، اصلش از اکبر آباد۔ شعر فارسی و ریختہ ہر دو می گوید۔ لیکن میلان طبعش  
 بہ طرف اشعار ہندی بیش تر است۔ شوخ طبع و ظریف مزاج و بہ ہجو گوئی راغب۔  
 اکثر باتیر و مرزا معارض شدہ و در اشعار ایں ہر دو برگزیدہ شعراے ہندوستان  
 سقم بر آوردہ و بہجو ہا گفتہ یہ سختگی کلامش و عذوبت گفتارش از تصانیفش ہودا  
 است۔ از شیریں کلامی اورست <sup>۲</sup>۔

شاہ کمال نے مجمع الانتخاب <sup>۳</sup> میں اور لطف نے گلشن ہند میں بقا کا نام  
 محمد بقا لکھا ہے۔

کریم الدین <sup>۴</sup> نے لطف کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ ۱۲۰۶ھ میں حج کے ارادے

<sup>۱</sup> قاسم : مجموعہ نغز جلد اول۔ طبع لاہور ص ۱۰۷

<sup>۲</sup> خوب چند ذکا نے محمد بقاء اللہ خاں نام لکھا ہے۔ (عیار الشعرا قلمی ورق ۳۱ الف)

<sup>۳</sup> میر محمد خاں سرور : عمدہ منتخبہ شائع کردہ شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی ص ۱۲۷

<sup>۴</sup> شاہ محمد کمال : مجمع الانتخاب قلمی ورق ۱۰۰ ب



سے حجاز کی طرف گئے تھے۔ یہ قول صحیح نقل نہیں ہوا۔ لطف کا بیان یہ ہے !  
 "بقا تخلص، محمد بقا نام، بیٹا حافظ لطف اللہ کا شاگردوں میں سے میرزا فناخر ملکین  
 تخلص کے تھا۔ فی الحقیقت عزیز نکتہ سنج و باریک بین و معنی بند و سخن آفریں تھا۔  
 میرزا رفیع سودا تخلص کے منہ اکثر چڑھا اور اس نہنگ بحر معانی کی ہجو میں کچھ کچھ  
 واہیات مکرر بکا، لیکن میرزاے مرحوم نے مطلق اعتناء کی اور یہ بات کہی کہ میں  
 نے جس کی ہجو کی، نام اس کا اسی تقریب سے تمام عالم میں ہوا مشہور ہے۔ سو  
 تیری ہجو نہ کروں گا کہ تیرا مشہور کرنا مجھے نہیں منظور ہے۔ غرض اس عزیز سے زمانے  
 نے موافقت کبھی نہ کی اور صورت روزگار کی بیچارے نے آئینے میں خیال کے  
 بھی نہ دیکھی۔ افلاس سے تنگ اگر کسی کے کہے سے کچھ اعمال تسخیر کو اکبے شروع  
 کیے تھے۔ خیال میں اس سوداے خام کے مجنوں ہوئے اور جب تک جیے  
 سودائی رہے۔ ۱۲۰۶ھ بارہ سو چھ ہجری تھی کہ حالت میں سودائی کے یہ بات  
 سوچھی کہ تحصیل دولت عقبی کیجیے اور خاک راہ سے کر بلا، معلّا اور نجف اشرف  
 کی دیدہ دل میں سرمہ حق نہا دیجیے۔ یہ عزم کر کے جہاز پر سوار ہوئے اور منزل  
 مقصود کی طرف قدم گزار ہوئے۔ اثنائے راہ میں اس دارِ قانی سے، موافق  
 نام اپنے کے، سفر ملک بقا کا کیا۔"

کریم الدین نے بقا کا شمار طبقہ دوم کے شعرا میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ حاتم،  
 درد اور ملکین کے شاگرد تھے:

"اول اوس نے تخلص غمیں رکھا بعد ازاں دہلی میں آکر بقا تخلص اختیار کیا۔ یہ  
 تخلص بہ سبب فرمانے شاہ حاتم کے جو کہ اوس کا استاد تھا بدلاتھا۔ خواجہ میر درد



سے بھی اس نے اصلاح لی ہے.... لطف کہتا ہے کہ بقا بارادہ ج درمیان  
۱۲۰۶ء کے جانب حجاز کے گیا تھا۔ اسی سال میں درمیان راہ کے داربستا  
کو پہنچا۔<sup>۱</sup>

شیفۃ نے بھی لکھا ہے کہ بقا، درد کے شاگرد تھے۔ گلشن بیجار میں انھوں نے  
بقا کے طرزِ "بامزہ و شیریں" کی تعریف کی ہے:

"بقا تخلص شیخ محمد بقا، اللہ خلف حافظ لطف اللہ خوشنویس اصلش از اکبر آباد  
و منشاران لکھنؤ، خاطر ظرافت پسند داشت۔ بل از ظرافت در گزشتہ سر بہ ہجا  
کشیدہ بشریک دورہ میر و سودا و بانیان بیشتر طرف شدہ و ہجو ہا گفتہ و در  
مراتب نظم طلبے شگفتہ و رنگین و طرے بامزہ و شیریں داشتہ کمتر کہ بقا پارسی  
ہم کام و زبان را حلاوت آگیس می نمودہ پیارسی شاگرد مرزا فاخر مکیں و در ریختہ  
از ملائذہ شاہ حاتم و خواجہ میر درد غفر اللہ لہما نوشتہ اند۔<sup>۲</sup>

ڈاکٹر اشپرنگر نے لکھا ہے:

"بقا۔ شیخ محمد بقا، اللہ خاں ولد خوشنویس حافظ لطف اللہ خاں، ساکن آگرہ،  
یہ لکھنؤ میں رہتے ہیں اور مکیں کے شاگرد ہیں (تذکرہ علی ابراہیم) پہلے ان کا  
تخلص غمیں تھا؛ اور فارسی میں بھی نظمیں کہا کرتے تھے۔ مصحفی ان کے دوست  
تھے؛ اور ان کے بیان کے مطابق یہ ۱۲۰۹ء میں زندہ تھے، اور لکھنؤ میں رہا  
کرتے تھے۔ عشقی بھی کہتے ہیں کہ جب انھوں نے اپنا تذکرہ لکھا تو یہ زندہ تھے۔  
لیکن صاحب گلشن ہند کے خیال میں انھوں نے ۱۲۰۶ء میں انتقال کیا۔<sup>۳</sup>

<sup>۱</sup> تذکرہ کریم الدین۔ نسخہ قدیمہ مطبوعہ دہلی ص ۲۰۰

<sup>۲</sup> شیفۃ: گلشن بے خار نول کشود ص ۳۳

<sup>۳</sup> اشپرنگر: یادگار شعرا مترجمہ طفیل احمد ص ۳۹



عشقی نے ان کو "ادام الشربقاہ" لکھا ہے اور نام محمد بقا:

"بقا تخلص، دہلوی اسمش شیخ محمد بقا ادام الشربقاہ۔ مردے متعدد خوشگو۔ از یاران  
میر غلام حسن، حسن تخلص است، مشق فارسی باستصلاح مرزا فخر مکین می نماید و  
در طرز ریختہ نیز داد فصاحت و بلاغت می دہد۔ غرض کہ بالفعل در شہر لکھنؤ  
بزمرد معاصرین ہنگامہ سخنوری گرم دارو<sup>۱</sup>۔"

منوالال نے گلدستہ نشاط میں بقا کا ایک شعر نقل کیا ہے:

ماہِ نو، انجم کے عقدے کس طرح سے وا کسے

ہوں جہاں لاکھوں گرہ وال یکناخن کیا کرے

عشقی اور لطف نے بقا کا نام محمد بقا اور منوالال نے میر بقا خاں لکھا۔

محمد حسین آزاد نے بقا کا نام وہی لکھا ہے جو عشقی نے اور ان کو فارسی میں

مرزا فخر مکین اور اردو میں شاہ حاتم کا شاگرد قرار دیا ہے۔ آب حیات کی رو سے

ان کا مولد دہلی اور اکبر آباد وطن تھا۔ وہ لکھنؤ میں جا بے تھے اور تیس سو سو اور نو

۱۔ عشقی: بحوالہ دو تذکرے مطبوعہ پٹنہ ص ۹۲

۲۔ منوالال: گلدستہ نشاط: مطبوعہ کلکتہ ۱۸۳۶ء ص ۳۹۶

۳۔ عشقی (پٹنہ) ص ۹۲

۴۔ لطف: گلشن ہند۔ ص ۷۰

۵۔ منوالال: گلدستہ نشاط ۱۸۳۶ء ص ۳۹۶



خاطر میں نہ لاتے تھے۔

یکجا اور لطف دونوں کا یہ بیان ہے کہ بقا کو جنون ہی کی حالت میں کر بلا معالی  
بعض اشرف کی زیارت کا شوق ہوا لیکن اثنائے راہ میں انتقال کیا۔ لطف نے  
سفر کی تاریخ ۱۲۰۶ھ دی ہے اور یہی ان کی رحلت کی تاریخ ہے لیکن تذکرہ  
روشن میں ہے کہ ”تا سال بستم از مائتہ سیر و ہم در قید حیات بود۔“

بقا صفت اول کے شعرا میں نہیں ہیں۔ تیسرے سودا کے آگے ان کا چراغ نہ جل  
اپنا لوہا منوانے کے لیے انھوں نے ان استادوں کے رنگ میں کہنے کی کوشش  
کی جب ان کی ہم سری نصیب نہ ہو سکی تو ان کی ہجو میں کہیں اور اپنے دل کا  
غوب خوب نکالا۔ بقا اس نکتے کو نہیں سمجھے کہ تیسرے کے فکر و فن میں جو وحدت ہے  
کے لب و لہجے میں جو بلند سنجیدگی اور ماورائی سادگی ہے وہ ”زور بازو“ سے  
نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح سودا کی عظمت کا راز صرف یہ نہیں ہے کہ انھوں نے  
خ زمینوں کو پانی کر دیا ہے بلکہ ان کی بڑائی، ان کی دیدہ وری، ان کے  
شعور اور سماجی احساس میں پوشیدہ ہے۔ بقا نے سودا کی ریس میں مشکل  
میں شعر کہے (بقول اُن کے ”رثاکِ غزل سودا“) لیکن بعض مہمل ہو کر رہ  
ان کے عالم خیال کا مدعا عنقا ہی رہا۔ بقا نے پردے کے نقش و نگار کو  
باور کر لیا۔ اس کے پیچھے جو معنی کا جلوہ ہے اسے نہیں دیکھا۔ اُن کی اس  
زلیں محض لفظی بازی گری کا نمونہ ہیں :

د : آب حیات طبع لاہور ص ۱۵۴ - حاشیہ۔

ص ۸۰ و ۸۱

ص ۷۱ و ۷۰



قاتل جو ملے مجھ سے کفن نذر پکڑ کر ۷  
 جو چشم و دل سے چڑھا دوں نالے، بہ آب اول دوم بہ آتش ۷  
 کر کے باتاب نگہ یاں تن و آتش کو بہم ۷  
 میری گو آہ سے جنگل نہ جلے، خشک تو ہو ۷  
 اور اس بات کو بھی ظاہر کرتی ہیں کہ وہ اسلوب جو انشا، ناسخ اور نصیر سے منسوب  
 کیا جاتا ہے، اس کا پہلا نقش سودا اور بقا ہی کی بدولت صورت پذیر ہوا۔  
 بقا، تیر کے زمانے میں شعر کہہ رہے تھے جو خداے سخن ہیں۔ وہ سودا کے  
 زمانے میں سخنوری کر رہے تھے جو طنز کے بادشاہ اور قصیدے میں انوری و خاقانی  
 کے ہم رتبہ ہیں۔ ان استادوں کے آفتاب کمال کے سامنے معمولی ستاروں کا  
 بے نور ہونا حیرت انگیز نہیں۔ حیرت انگیز ان کے بعض غزلیہ اشعار ہیں۔ ملاحظہ ہو  
 عشق میں بُو ہے کبریائی کی عاشقی جس نے کی، خدائی کی  
 ہماری مت صبا سے کراے آہ تو نے بھی کچھ گرہ کشائی کی  
 لے چلے ہم قفس سے لے صیاد خاک میں آرزو رہائی کی  
 روزِ محشر تلک نہ آخر ہوں داستانیں شبِ جدائی کی

راستی پر ہم سے کس دن آئیاں یار کی زلفیں جو ہیں بل کھائیاں  
 مرجار و رو کے اے ابر مرثہ روز ساون کی رتیں دکھلائیاں  
 جل کے خاکستر ہوا غم سے بقا اے میاں اتنی بھی بے پروائیاں

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا، واہ رے



بیرود وضع ہیں، محفل سے شتاب ان کی اٹھو  
 پاس ایسوں کے تم اے جان بھلے بیٹھ گئے  
 اتواں ہم ہوئے یاں تک کہ تری محفل تک  
 گھر سے آتے ہوئے سو بار چلے بیٹھ گئے

میاں سچ ہے تمھاری تو بلا ہی جانے  
 دل کی واشد پہ عبث آہ نے کھینچی تکلیف  
 تم تو نت دور سے خمیازہ کش حسرت ہیں  
 مرے بیمار کو کیا ہوئے شفا جس کے طبیب  
 در پر اپنے سخن کون برا کہتا ہے  
 پر یہ انداز جو پوچھو تو بفتا ہی جانے  
 ان غزلوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز بقا کے قصائد ہیں جو الفاظ کی شوکت  
 شبیہات کی لطافت اور تراکیب کی خوش نمائی سے خالی نہیں ہیں۔ یہاں سودا  
 کے رخ روشن کے آگے شمع رکھنا یا بقا کا ان سے مقابلہ کرنا غلط ہوگا مگر جو قصیدے  
 مختصر سے مجلد میں شامل ہیں وہ شان و شوکت اور متانت و جزالت میں  
 ند پایہ نہ سہی لیکن پڑھنے کے قابل ضرور ہیں۔ خاص طور پر ان دو قصیدوں  
 تو انھوں نے شاندار الفاظ اور باوقار شبیہات کا انبار لگا دیا ہے :

۱۔ جب مری چشم گئی نیند سے کل رات جھپک۔

۲۔ کل حضرت بقا سے کیا میں نے یہ سوال

بقا کی ہجویات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتیں۔ وہ تیسرے سودا دونوں کی  
 عری کے منکر تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں :

لھول دیوانوں صاحب کے  
 اے بقا ہم نے جب زیارت کی  
 شعر سودا و میر کے دیکھے  
 وہ تو "تو تو" کریں ہیں "یہ ہی ہی"



آزاد نے لکھا ہے کہ سودا اور مرزا فاخر کے معرکے میں بقاۃ الشراخاں بقتا  
درمیان میں پڑے کہ زبانی پیاموں سے عبرت الغافلین کے داغوں کو دھوئیں  
جس میں سودا نے مرزا فاخر کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو ظاہر کیا تھا۔ فاخر کا ایک  
شعر ہے ۵

گرفتہ بود دریں بزم چوں قدح دل من      شگفتہ روی صہبا شگفتہ کرد مرا  
سودا کو اعتراض تھا کہ قدح کو گرفتہ دل کہنا بے جا ہے۔ اہل انشانے ہمیشہ  
قدح کو کھلے پھول سے تشبیہ دی ہے یا ہنسی سے۔ آزاد لکھتے ہیں: "بقاۃ جواب  
میں شاگردی کا پسینا بہت بہایا اور اخیر کو باؤل کا ایک شعر بھی سند میں لائے یہ  
چہ نشاط بادہ بخشد بمن خراب بے تو      بہ دل گرفتہ ماند قدح شراب بے تو  
مرزا رفیع سن کر بہت ہنسے اور کہا کہ اپنے استاد سے کہنا کہ استادوں  
کے شعروں کو دیکھا کرو تو سمجھا بھی کرو۔ یہ شعر تو میرے اعتراض کی تائید کرتا  
ہے۔ یعنی باوجودیکہ پیالہ ہنسی اور شگفتگی میں ضرب المثل ہے اور پیالہ شراب  
سامان نشاط ہے مگر وہ بھی دل افسردہ کا حکم رکھتا ہے۔ یہ

آزاد نے میر و بقا کے معرکے بھی بیان کیے ہیں اور میر کے ترجمے میں بقتا  
کے یہ دو شعر نقل کیے ہیں :

ان آنکھوں کانت گر یہ دستور ہے      دو آہ جہاں میں یہ مشہور ہے  
سیلاب سے آنکھوں کے بہتے ہیں خرابے میں      ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دو آہ میں

اس پر آزاد لکھتے ہیں کہ میر صاحب نے خدا جانے سن کر کہا یا تو ارد ہوا :

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں

سو کھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دو آہ



اس پر بقا نے جو قطعہ کہا تھا وہ اوپر نقل ہو چکا ہے۔  
 آزاد نے بقا کے چند اور شعر بھی نقل کیے ہیں۔ جن میں میر پر کھلی  
 چوٹیں ہیں یہ

میر صاحب پھر اس سے کیا بہتر  
 اس میں ہووے جو نام شاعر کا  
 لے کے دیواں پکارتے پھرے  
 ہر گلی کو چہ "کام شاعر کا"

توبہ زاہد کی توبہ تلی ہے  
 چلے بیٹھے تو شیخ چلی ہے  
 پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر  
 اور بستی نہیں یہ دلی ہے

بقا نے میر پر شہ قے کا الزام لگایا ہے۔ ان کے یہاں جو "کثرت  
 یک لفظ" ہے، اس کا مذاق اڑایا ہے، ان کی سیادت پر اعتراض کیا  
 ہے، ان کی خوے زشت اور طبع عجیب کو لائق ملامت ٹھہرایا ہے۔ لیکن بقا  
 کی ہجویات کے ہدف میر ہی نہیں، سودا بھی تھے اور بعض جگہ انھوں نے دونوں  
 کو لپیٹ میں لے لیا ہے :

مرزا دمیر باہم دونوں تھے نیم ملا  
 فن سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا  
 اس واسطے بقا اب ہجو کی ریسماں سے  
 دونوں کو باندھ باہم میں نے کیا ہے پورا

۱۔ آب حیات ص ۲۲۰ کلیات بقا ص ۷۵، ۷۶، ۸۰

۲۔ دیوان بقا ص ۷۵ و ۷۸

۳۔ ایضاً ص ۷۹

۴۔ ایضاً ص ۷۹

۵۔ ایضاً ص ۷۶



طرفہ لطیفہ ہے کہ کلیات سودا میں بقا کے خلاف کوئی ہجو نہیں ہے۔ اس خاموشی سے غالباً ان کا مقصد یہ تھا کہ بقا کو اہمیت نہ دی جائے۔ لطف نے سودا کا ایک قول بھی نقل کیا ہے :

”میں نے جس کی ہجو کی، نام اس کا اسی تقریب سے تمام عالم میں ہوا مشہور ہے۔ سوتیری ہجو نہ کروں گا کہ تیرا مشہور کرنا مجھے نہیں منظور ہے۔“

بقا کی ہجویات میں وہ وسعت نہیں ہے جو سودا کے یہاں ہے۔ بقا نہ معاشرے کی خرابیوں پر انگشت نمائی کرتے ہیں، نہ حکومت کے زوال و انحطاط کی کہانی سناتے ہیں۔ ان کا دائرہ فکر تنگ ہے۔ ان کی ہجویات شخصی ہیں اور ذاتی اختلافات کا نتیجہ ہیں لیکن وہ تخیلی اور تخلیقی ظرافت کے عناصر سے عاری نہیں ہیں اور ان کا مطالعہ تمیر اور عہدِ میر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

یکتا کا بیان ہے کہ بقا کے دوسرا اشعار لوگوں میں مشہور ہیں۔ علی ابراہیم خاں (اور لطف) نے جو اشعار دیے ہیں، وہ بھی وہ ہیں جو ان کے گوشہ خاطر میں محفوظ تھے۔ آخر میں تو فوراً دیوانگی میں یہ حال ہو گیا تھا کہ اپنے کلام کو پارہ پارہ کر کے اور ایک سوچے میں پانی ڈال کے رکھ لیا تھا اور جو طالبِ شعر آتا، اس سے کہتے اس میں میرا پورا کلیات ہے، جو چاہے لکھ لو لیکن خدا را ہجویات نہ لکھنا اس لیے کہ میں نے اس سے توبہ کر لی ہے !

ان حالات میں دیوانِ بقا کے قلمی نسخے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ہم نے جو نسخہ شائع کیا ہے وہ ڈاکٹر اشپزنگر کے ذخیرہ مخطوطات کی زینت رہ چکا ہے اور پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آیا ہے۔



اس نسخے کا ترجمہ یہ ہے :

”تمام شد دیوان ہندی تصنیف بقا بتار تخی بست یکم شہر ذی الحج ۱۲۲۱ھ  
روز جمعہ“۔

کاتب کا خط بہت اچھا ہے لیکن بلا کا غلط نویس ہے۔ اسی لیے متن کے  
تیار کرنے میں بہت سی دشواریاں پیش آئیں۔ اس کام میں پروفیسر ضیاء احمد  
بدایونی اور جناب رشید حسن خاں نے بڑی جان کھپائی ہے اور میں ان دونوں  
حضرات کا بے حد ممنون ہوں۔ جہاں الفاظ پڑھنے میں نہیں آئے وہاں نقطے  
لگا دیے ہیں یا خط کھینچ دیا ہے۔ بقا کے جو اشعار مختلف تذکروں میں ملتے ہیں  
ان سے مقابلہ بھی کر لیا گیا ہے۔ اس کلیات کی طباعت میں مولانا امیر حسن  
نورانی نے جو تکلیف اٹھائی اس کا بھی شکر گزار ہوں۔

خواجہ احمد فاروقی



## محققات

ن : مجموعہ نغز	ل : گلستانِ بے خزاں
م : تذکرہ میر حسن	ش : گلشنِ بے خار
ہ : تذکرہ ہندی	ک : کریم الدین
گ : گلِ رعنا	آ : آبِ حیات
ز : گلزارِ ابراہیم	شع : شعر الہند
د : دستور الفصاحت	مج : مجمع الانتخاب قلمی
ع : تذکرہ عشقی	س : انتخابِ حسرتِ مودہانی

سخ : سخنِ شعرا







# دیوانِ بقا

## غزلیات

طور پر اپنے سخن کون بُرا کہتا ہے  
پر یہ انداز جو پوچھو تو بقا ہی جانے







وہ انگارا ہے پہلو میں دل بیتاب، آتش کا  
 دل بیتاب چھٹ اپنے، کہ سوزِ غم سے خود گرہ ہے  
 کہ دیکھے سے جسے ہو جائے زہرہ آب آتش کا  
 نہ دیکھا ہم نشیں ہونے کہیں سیاب آتش کا  
 جلا آتش کا جو ہوئے، سو دیکھے خواب آتش کا  
 کتاب چارِ عنصر سے، پڑھے ہیں باب آتش کا  
 بڑے استادِ غم سے، مکتبِ ہستی میں، ہم پیالے  
 بقا نے روز و شب رو رو کے، آبِ چشم سے اپنے  
 نشانِ آخر کو عالم میں کیا نایاب آتش کا

تضائے حالِ گل، جب صفحہٴ تقدیر پر لکھا  
 ضعیفی سے نہیں پیروں کے چپیں پیشانی رو پر  
 مری دیوانگی کا ماجرا زنجیر پر لکھا  
 یہ خطِ ناامیدی ہے کہ رے پیر پر لکھا  
 اب اپنے خوں کا محضر گردنِ گلگیر پر لکھا  
 جہاں تک موج نے سطروں کو جو شیر پر لکھا  
 یہ سب مضمون ہے شیریں، کوکھن کی رو سپیدی کا  
 بقا کے دل میں آ، آئینہ تیری قدر کیا جانے  
 عبث ہے نقشِ گل گر بلبَلِ تصویر پر لکھا

خالِ لبِ آنِ جاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا  
 خواہشِ سود تھی، سودے میں محبت کے، وے  
 دام، دانے میں نہاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا  
 سرِ بسر اس میں زیاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا  
 اس قدر سیفِ زباں تھا، مجھے معلوم نہ تھا  
 میں تو آیا تھا بقا باغ میں، سن جوشِ بہار  
 پر یہ ہنگامِ حزنِ اناں تھا، مجھے معلوم نہ تھا



دستِ ناصح جو مرے جیب کو اس بار لگا  
 پہنچے اُس بُت کو خبر نہالہ تنہائی کی  
 مرضِ عشق تمہارا تو یہ طوفاں ہے کہ میں  
 جس کا ملاح بنا عشق، وہ کشتی ڈوبی  
 مرغِ زیرک تھے، تیرے دام نہ آئے ہرگز  
 دردِ یہ دل میں اٹھارات کہ ہو گرم تیش  
 پردہِ خاک سے دی مجھ کو کسی نے آواز  
 پھر تو غفلت زدہ تا خوابِ عدم ہے یاں تو  
 جب میں دیکھوں ہوں تو کثرتِ ہو خریداروں کی  
 کھینچ پیچھے کو قدم آہ میں یاں تک رویا  
 کہ مرے آگے بقا دُر کا اک انبار لگا

کعبہ تو سنگ و خشت سے لے شیخ مل بنا  
 کچھ سنگِ سچ رہا تھا، سُر اُس بُت کا دل بنا  
 اتنا ہوا ضعیف کہ مسیرے مزار پر  
 جو برگِ گل پڑا ہے، سو چھاتی کا سل بنا  
 ہو کر یہ بقا کا ستارہ نصیب کا  
 روزِ نخست عارضِ خواباں کا تل بنا

اے ش، ک: یک بار۔ سچ: جینا صبح جو مرے ہاتھ کو اک بار لگا۔ اے: یاد کو بھیجی خبر۔ د، گ، ش، ک: یاد کو پہنچی خبر  
 اے، د، ش، ک، س: پس دیوار

اے س۔

اے س: سو عاشق کا دل بنا



سیکھا جو قلم سے نے حسالی کا بجانا  
 کر نغمہ بختا فکر ت عالی کا بجانا  
 تسمہ مرے مت دل پہ دوالی کا بجانا  
 یہ لٹ جو ہے، چابک اسی کالی کا بجانا  
 مارا کیے مطرب بچگاں دل پہ تھپیرے  
 سیکھے اسی طبلے پہ وہ تالی کا بجانا  
 الفت میں تری لے بت بے مہر و محبت  
 آیا ہمیں اک ہاتھ سے تالی کا بجانا  
 لے مول مرے دل کا وہ جب [ساغر نازک]  
 یاد آئے نہ کاش اُس کو سفالی کا بجانا  
 اس نالہ بے صوت نے حیرت میں سکھایا  
 ساز اب مجھے تصویر نہالی کا بجانا  
 بس لے غم غماز، مری آہ جگر سے  
 آفت ہے ترا بام پہ تھالی کا بجانا  
 بے ساتی دے، سوچ میں، ہے کام ہمارا  
 بیٹھے سر ناخن سے پیالی کا بجانا  
 اُس کو دک بے ہوش کا، آفت ہی، شب اٹھ کر  
 ٹھیکوں پہ مری آہ کے، تالی کا بجانا  
 سنتا ہوں کسی پرچ کی جب دت زنی فکر  
 آتا ہے مجھے یاد دت تالی کا بجانا  
 کرتا ہے بقا نالہ، تو کر جھانج میں دل سے  
 بے جھانج ہے کیا اس دت خالی کا بجانا

قلم صفت میں پس از مراتب بدن ثنا میں تری کھپایا  
 بدن زباں میں، زباں سخن میں، سخن ثنا میں تری کھپایا

بہ رنگ شمع و درا و خامہ، ترے طریق ثنا کا جو یا  
 کبھی ہے ساکت، کبھی ہے نالاں، کبھی ہے راقم، کبھی ہے گویا

پھلک کے دیدہ تر ہے مٹناں! پیالہ لاسا  
 بغل میں پھوٹ بہا شیشہ دل کا پھالاسا



کل دستِ محتسب سے جوں توں مجھے چھڑایا      شیشے نے میری خاطر اپنا گلا بندھایا

اُس کف میں دیکھ ساغرِ نازک شراب کا      دریا میں سرنگوں ہے پیالہ حباب کا

ہم نفس کوئی نہ دیکھا بے کسی کے دن بقا      آشنا صورت مگر معنی میں وہ بے گنا نہ تھا  
سرسری مل کے مرے پاس سے جانا کیا تھا      راہ بس ناپنے آئے تھے، یہ آنا کیا تھا  
شب اوس شکر لب کی کروں یادیں گر خواب      تو خواب نہ آئے، مگر آئے تو شکر خواب

مت تنگ ہو، کرے جو فلک تجھ کو تنگ دست      آہستہ کھینچے، جو دبے زیرِ تنگ، دست  
گلے حنا سے، گاہ مرے خوں سے سرخ ہو      سو سو طرح سے، اُس کے دکھاتے ہیں رنگ، دست  
دیتا ہے کف سے دولتِ پابوس شمع کی      روئے گا سر پہ دھڑکے پھر آخرِ تنگ، دست  
بھرا آنکھ تجھ کو غیر نے دیکھا، تو پھر مرے      لیویں گے انگلیوں ہی سے کارِ خدنگ، دست  
جُز گشتِ دُخونِ بے گنہاں، آستیں سے تو      باہر نکالتا ہے کب اے خانہ جنگ، دست

مفت اس کے ہاتھ اب جو بقا سا لگے شکار

پھر کب کرے قصور یہ چرخِ پلنگ دست

غم میں اُس زلف و رخ کے ہم ہیہات      رات کو دن کریں ہیں، دن کو رات

۴ م      ۵ ن      ۶ گ      ۷ س

۷ مخطوطے میں اس غزل پر یہ عنوان لکھا ہوا ہے: "اترے اے بوسہ از شیخ جی" عنوان بظاہر غیر ضروری

معلوم ہوتا ہے اس لیے متن میں نہیں لکھا گیا۔



کیوں نہ شانے سے دب چلیں یہ شوخ  
جن کی چوٹی لگی ہے اُس کے ہات  
چڑھ کے اسپ اجل پہ، ہستی سے  
شیخ جی لے گئے عدم کو بدات  
عکسِ حق ہوں جہاں کے آئنے میں  
میری اور اُس کی ایک ہیں حرکات  
چاہیے ٹمک اُدھر سے حسنِ قبول  
پھر تو ہیں سیّات بھی حنات  
اُس خطِ پشتِ لب نے چھوڑا ہے  
آبِ حیواں پہ بردہ ظلمات  
بوسہ دینے میں لب کے سوچو مت  
ہے یہ حق میں بقا کے آبِ حیات

دل دیکھ کے رہتا ہے ہر آن تری قدرت  
دُراجِ صفت گویاں، سبھان تری قدرت

ہم کو جو کچھ مفید جہاں کا نہیں علاج  
شاید مریضِ چشمِ بتاں کا نہیں علاج  
نکلے ہے منہ سے بات بہ لکنت تیرے حضور  
گو دل لے ہے بجا، یہ زباں کا نہیں علاج  
بے کل لے ہے نت کے لچکنے سے وہ کمر  
اُس مومیاں کے موئے میاں کا نہیں علاج  
کہتا ہے دق ہو، غنچہ گل سے، وہ خوشِ داغ  
دنیا میں تجھ سے گندہ دہاں کا نہیں علاج  
سُن دردِ دل کو میرے لگا کہنے یوں طبیب  
ہر درد کی دوا ہے، یہ یاں کا نہیں علاج (کذا)

لاؤں جو شکوہ شبِ ہجراں سخن کے بیچ  
جوں شمع پھر زباں نہ سماوے دہن کے بیچ  
اس باغ میں شگوندہ نورس تو ہوں، ولے  
سو چاکِ مثلِ گل ہیں مرے پیرہن کے بیچ  
کھا لالہ داغ، صحنِ چین سے نکل گئے  
خونیں دلوں کو چین کہاں ہے وطن کے بیچ  
لے جا کے بوے زلف تری، بادِ صبح نے  
خوں کر دیے ہیں نافہ آہو، ختن کے بیچ



اتنا گھلا ہوں حسرت دیدار سے کہ اب  
جلدی پہنچ کہ اشک کے دریا میں جوں جا  
جز چشم کچھ رہا نہیں باقی بدن کے بیچ  
دم آ رہا ہے یار ہمارا نین کے بیچ  
یکتا سے روزگار بھی ہو، تابعتا تجھے (ق) پہنچے کمال مرتبہ شعرو سخن کے بیچ  
یک شعر نثر درد تو ہرگز نہ کہہ سکے  
ہر مو اگر زبان ہو تیرے بدن کے بیچ

اے جنوں! یمن قدم سے تم سے اک آن کے بیچ  
قشہ کاموں سے نہ منہ موڑ کہ جب خط آیا  
خونِ عاشق کے لیے سحر ہے یہ سرخی لب  
اکے کرتا ہے خلل شانہ جو عشاق کے دل  
کیوں نہ گردش میں ہے ہم سا جو کوئی آوارہ  
پڑ گئی لاگ مرے دست و گریبان کے بیچ  
پھر تو یہ آب کہاں چاہ زرخدان کے بیچ  
کیا کھلایا ہے رقیبوں نے تجھے پان کے بیچ  
جمع ہوتے ہیں تری زلف پریشان کے بیچ  
خاک ہو کر ہو ملا ریگ بیابان کے بیچ  
بانگِ تکبیر تو ایسی ہے بقا سینہ خراش  
انگلیاں آپ موڈن نے دھریں کان کے بیچ

مے خون کی جا، اپنی تو رگ رگ میں رہی بیچ  
یوں دل شہرے نالاں ہیں تم سے جلوے کے ہنگام  
بے خال، تری زلف میں کب دل ہو گرفتار  
تل دھرنے کی جاگہ نہیں ان میں ہی چہ جادول  
زاہدی کوئی خشک ہے جو اس سے گیا بیچ  
جوں موسم گل، بلبلوں میں دھوم رہے مچ  
جو مرغ پھنسے دام میں، دانے ہی کی لالچ  
زلفوں میں بھرے ہیں تری، دل ایسے مچاچ

ہے جیسی بقا کی غزل، ایسی نہ ہو مضبوط  
سو دوا جو کوئی ریت کے گھر پہ کرے گچ



کھب گئی چشم میں جب سے کمر یار کی طرح  
ہائے کیا درد ہے سینے میں دل محروں کو  
دید کو تیری، شب و روز کھلی رہتی ہیں  
تو وہ یوسف ہے کہ دن رات خریداری کو  
رگِ گل دل میں کھڑکتی ہر مرے خار کی طرح  
رات دن اب تو کر لے ہے یہ بیمار کی طرح  
چشم حیرت زدگیاں، رختہ دیوار کی طرح  
آمد و رفت تے گھر میں ہے بازار کی طرح  
پہلے جو پانو تری سمت پڑے، اُس پہ بقا  
دوسرا پانو تصدق کرے، پرکار کی طرح

رکھتا تھا جب کہ اشکِ جہاں گرد رنگِ سُرخ  
ہر دشت، لالہ زار تھا۔ ہر کوہ، سنگِ سُرخ

دل خوں ہے غم سے اور جگر ایک نشہ دوشد  
رسوا تو نالہ کر کے ہوئے، لیکن اُس نے یار  
اول تو ہم کو طاقتِ پروا نہ ہی نہ تھی  
پایا نہ ہم نے سودِ محبت میں یار کی  
چھڑکا مرے جگر پہ نمک، غیر سے رہا  
آوارہ جوں صبا ہوں، پر اب جستجوئے یار  
مشکل تھا دیکھنا ہی ترا، تس پہ روزِ وصل  
نالاں ہم اپنے اشک کے ہاتھوں تھے، اب بقا  
بہنے لگیں ہیں سختِ جگر، یک نشہ دوشد  
لب خشک ہیں تو چشم ہے تر، یک نشہ دوشد  
دل میں تے کیا نہ اثر، یک نشہ دوشد  
تس پر بربیدہ ہو گئے پر، یک نشہ دوشد  
اس پر بھی پہنچتا ہے ضرر، یک نشہ دوشد  
پیوستہ مثل شیر و شکر، یک نشہ دوشد  
کھتی ہے مجھ کو خاکِ سر، یک نشہ دوشد  
لائی نہ چشم تابِ نظر، یک نشہ دوشد  
نالاں ہم اپنے اشک کے ہاتھوں تھے، اب بقا  
بہنے لگیں ہیں سختِ جگر، یک نشہ دوشد



رکھتا ہے یوں وہ زلفِ سیہ قام دوش پر  
 شانے تلک چڑھے بن، اب آنسو کو کب ہے چین  
 اک دن ملا جو شیخ، تو پھر میکشوں کے ساتھ  
 ملنا تو آج بھی نہ ہوا شب کو (اور) اٹھا  
 ہے دل میں، گھر کو شہر سے صحرا میں لے چلیں  
 وہ زشت بخت ہوں کہ ملائک کو بھی مرے  
 نیکی مری تو نام بدوں کے کہیں رقم  
 مطرب بچوں نے شیخ کو ٹنگیا لیا تمام  
 ڈالانا بارِ عشق زمیں پر بفتا نے یار  
 سر سے اگر گرا، تو لیا تھام دوش پر

آوے جو ناز سے مرا وہ بتِ سیم بہ بہ  
 چشم بہ چشم، رو بہ رو، سینہ بہ سینہ، دل بہ دل  
 تم تو رہو ہو ہر باں غیر کے ساتھ اس طرح  
 اے بتِ مہروش کبھی ٹلک تو نگاہِ گرم ہو  
 کاہے کو لے پھرے مجھے میرا نصیب دربد  
 ساق بہ ساق دل بہ لب، پائے بہ پائے، سر بہ سر  
 اور میں پھروں ہوں خوار و زار خانہ بہ خانہ، گھر بہ گھر  
 اشک سے کب تلک رہیں دامنِ وجیب تیرے تہ  
 دامِ بلا سے اب بقا ہم سے اسیر کب چھٹیں  
 رشتہ غم سے گتھ گئے بال بہ بال، پر بہ پر

نہ لے اس دل کو نظروں میں جھپٹ کر  
 مبادا یہ لگے جادو پلٹ کر



کرے مرثاگاں سے کب تک نیزہ بازی  
ہوا الماسِ عنم سینے میں کاری  
گدازِ غم سے ان لیلیٰ و شوں کے  
گڑی ہے میخ دیں کبے کے دربر  
ہماری چشمِ تر کے گھر سے یارب  
شبِ فرقت میں چشمِ تر کا دریا  
نہیند آتی ہے، نے گرتا ہے سر سے

بقا، روشن چراغِ چشمِ تر رکھ

فتیلہ رشتہ مرثاگاں سے بٹ کر  
رشتہ مرثاگاں سے بٹ کر

قاتل جو ملے مجھ سے کفنِ نذر پکڑ کر  
وہ شامِ غریباں ہے تری زلف کہ جس سے  
ناگن کے تصور میں تری زلف سے آکر  
نکھت پہ تری زلف کی ملتے ہیں صبا سے  
دریا پہ دم گریہ مری چشم سے آکر  
تیرے دہنِ تنگ سے ہنگامِ تبسم  
گردش سے تری نرگسِ فتاں کی زمانہ  
وہ ماہِ محرم تری ہجرت ہے کہ جس سے  
تو یار وہ گل ہے کہ ترے سامنے آوے  
اُس زلفِ شکن دار سے دل ہلے شکستہ  
جس دم ملے تجھ سے کوئی عاشقِ تنِ بے جاں (ق) اپنا تن و جاں سر و علنِ نذر پکڑ کر

دھردوں میں چھری اور لگنِ نذر پکڑ کر  
رخسارِ ملا صبحِ وطنِ نذر پکڑ کر  
کالے بھی جو ملتے ہیں تو منِ نذر پکڑ کر  
نافی کو سب آہوے ختنِ نذر پکڑ کر  
ملتی ہے صدق، درِ عدلِ نذر پکڑ کر  
ہر غنچہ ملا دل بہ دہنِ نذر پکڑ کر  
آخر کو ملا اپنا چلنِ نذر پکڑ کر  
ہجرت کا محرم ملے سنِ نذر پکڑ کر  
منتقار میں گلِ مرغِ چمنِ نذر پکڑ کر  
ملتے ہیں بہم اپنی شکنِ نذر پکڑ کر  
اپنا تن و جاں سر و علنِ نذر پکڑ کر



تو اُس کے تن و جاں سے ترے سامنے آوے  
ہم طاؤز نو گلشنِ دنیا میں ہیں صیاد  
جب در نہ پڑے دم میں، تو آخر کو ہونے رام  
تو سن پہ تجھے دیکھے تو ..... آوے  
.....

اب کیونکے رہوں شہر میں بے یار کہ وحشت  
گردوں پہ فقط لے گئے سراپنا مہ و نہر  
دیکھے لبِ لعل اُس بتِ ہندی کا تو اس کو  
اُس ظالمِ بیدرد سے ہم دردِ دل اپنا  
آئی ہے مرے سامنے بن نذر پکڑا کر  
قاتل کو زمین بیچ بدن نذر پکڑا کر  
دل جاے عقیق، آئے یمن نذر پکڑا کر  
کہتے ہیں ولے چوب ورسن نذر پکڑا کر  
پاتا ہوں دمِ فکر بقا بات میں بات  
ملتا ہے سخن مجھ سے سخن نذر پکڑا کر

اُس صیدِ فلک نے جو دھرا دام زمیں پر  
گردوں پہ گیا دور میں اُس لب کے میسھا  
اک صید کا ہرگز نہ رہا نام زمیں پر  
یعنی کچھ اب اُس کا نہ رہا کام زمیں پر  
شیشہ تو فلک پر ہے سدا جام زمیں پر

ترکی اُس چشم کی ہے ابروے خمدار کے زور  
پھین لیتی ہے دلِ خلق وہ تلوار کے زور



مجھ کو نہ اب دل ہے نہ جاں ہے عزیز      پر وہ بتِ جانِ جہاں ہے عزیز  
غیر سے کہتا ہے مرے حق میں یار (ق)      دیکھو تو اس دم وہ کہاں ہے عزیز  
در پہ جو بیٹھا ہو تو اس سے کہو      جائے، جو اپنی اُسے جاں ہے عزیز  
پر اُسے معلوم نہیں ہے کہ جان      عاشقِ بیدل کو کہاں ہے عزیز  
مجھ کو بھتا بہرِ سخن خامہ دار  
سارے بدن میں یہ زباں ہے عزیز

سب رنگِ عاریت وہ سمجھتا ہے رنگِ ناز      بہتر ہزار رنگ سے اُس کا ہے رنگِ ناز  
نچلا رہا کبھو نہ مرا طفلِ نے سوار      کرتا ہے شوخیوں سے نت اٹھ کر (وہ) تنگِ ناز  
دامن نہ چھڑوں میں، تو چھڑاؤے جھٹک جھٹک      کرتی ہے مجھ کو قتل اب اُس کی یہ جنگِ ناز  
بر خود غلط ہمیں ہیں، کچھ اُس کا نہیں تصور      یاں وقفہ نیاز ہے، واں ہے درنگِ ناز  
ہے سخت رو بہت پسرِ شیخ، دیکھیے      پڑتا ہے کس کے تیشہ دل پر یہ سنگِ ناز  
ہے مجھ نیاز مند کو کچھ اور ہی اُمنگ      یارو، میں کیونکے شعر میں باندھوں اُمنگِ ناز  
شوخی پہ ہے کیتِ قلم، اس کو پھر بھتا  
جولاں دے اس زمیں میں ذرا کس کے تنگِ ناز

میں ہو چکا ہوں یار نشانِ خدنگِ ناز      زانِ پیشتر کہ سوی من آبی بجنگِ ناز  
اُس ابرو کی کماں سے لگے دل پہ پے پے      تیرنگاہ ، ناوکِ غمرہ ، خدنگِ ناز



یہ دور میں نہیں نگہ اس ترک چشم کی درپردہ میزند بدل من تفتنگِ ناز  
 آہوے چشمِ یار نہ ہونے کسی کا رام درگردش اگر نبود پاہنگِ ناز  
 نازبتاں اٹھا نہیں سکنے کا تو بفتا  
 زن بوسہ و بہل کہ گرانست سنگِ ناز

دلا، اٹھائے ہر طرح اس کی چشم کا ناز زمانہ باتو نسا زد، تو بازمانہ ساز

ہے تپاں زیرِ زمیں کون جگر چاک ہنوز کہ تزلزل میں رہے ہے کرہ خاک ہنوز

جو چشمِ دل سے چڑھا دوں نالے بہ آبِ اول دوم بہ آتش

تو ماہ و خور کے بھروں پیالے بہ آبِ اول دوم بہ آتش  
 جو چشمِ روئے، تو دل بھی آہوں میں میری نختِ جگر پر وے

بچے وہ سمن تری، یہ مالے بہ آبِ اول دوم بہ آتش  
 جو کوئی تربت پہ میری گزرے، تو تابِ اشک و تبِ فناں سے

پڑیں دو ہر ہر قدم پہ پچھالے بہ آبِ اول دوم بہ آتش  
 جو آہ بیچاں اشکِ شب کو فلک پہ گردشِ کناں چڑھے گا

تو گدہ دہہ دو پڑیں گے ہالے بہ آبِ اول دوم بہ آتش  
 سرشکِ دآہ اب یہ بے اثر ہیں کہ جا فلک تک شبِ جدائی

دیرِ اثرِ یہ دے میں تالے بہ آبِ اول دوم بہ آتش  
 مباد، فرقت میں چشمِ دل کی، یہ اشکِ ریزی اندر آہِ خیر بی

بلاے ناگہ جہاں پہ ڈالے بہ آبِ اول دوم بہ آتش



فلک سے دیروں کی طرح اُس بن، شرک آہ بقا سے اب تو  
چڑھے ہیں لڑنے کو دو رسالے بہ آبِ اول دوم بہ آتش

یار سے ہم کو نہ آئی کبھی درپیش غرض  
تیرے لگ چلنے سے ڈرتے ہیں ہم اے کرشمِ عشق  
بیشِ دکم پیار کے رمزوں سے یہ معلوم ہوا  
دل کے لینے ہی تلک یار تھے، بس ہم نے میاں  
در نہ رکھتے ہیں سبھی شاہ سے درویشِ غرض  
عاقبت ہم پہ لگانا ہے تجھے نیش، غرض  
یار کچھ ہم سے بھی رکھتا ہے کم و بیش غرض  
تم سا خود کام نہ دیکھا کوئی اور خوش غرض  
خوں مری چشم سے ہوتا ہی نہیں بند بفتا  
ابھی بہتا ہے یہ ناسورِ دل ریش غرض

آدیں سمس (کڑا) میں جو وہ رخسارِ آتش رنگ و شمع  
تو نہ ہوں ہم سنگِ یکدگر مگر پانگ و شمع  
وقتِ شب گیر.... اس کے تھے ہم بھی پے محل رواں  
گوشِ چشم اپنے لگائے برصدائے رنگ و شمع  
میل تجھ سے سنگِ دل کا، گو نہیں میں مومِ دل  
نسبتِ آتش تو باقی ہے میانِ سنگ و شمع  
راہ دکھلاتا ہے لیکن آپ چل سکتا نہیں  
خضرِ رہ اچھا ہے نا صح پر بہ پائے رنگ و شمع  
مختب بگڑے، تو دیں ہم مست شمع اُس کی جلا  
تار ہے مشہور مست و مختب کی جنگ و شمع  
بزمِ آرائی کرے وہ باغ میں شب کو، تو ہو



نرگسِ مست تری جائے جو تُل بر سرِ گُل  
 موجِ زن دیکھ ترے حُسن کا دریائے بہار  
 اپنی نازک بدنی سے جو ہو ساقی کو خبر  
 کھول کر باغ میں تیرا جُزْ مجموعہ حُسن  
 تیغِ ابرو سے گرائے سرِ گُل بر سرِ گُل  
 باندھ دے باوِ صبا خاک کے پُل بر سرِ گُل  
 پھر تو ہرگز نہ پیے بیٹھ کے تُل بر سرِ گُل  
 آج لائی ہے صبا آفتِ گُل بر سرِ گُل  
 گر بقا، ناز سے گویا ہو مرا غنچہ دہن  
 گردنِ غنچہ گرے شرم سے ڈھل بر سرِ گُل

گر ترے در پہ نہاں زیرِ زمیں کھویا دل  
 کون سا آئینہ رو اُس سے مقابل ہو کہ اب  
 دیکھیں کیا لاٹھے ثمرِ خاک میں بویا دل  
 مثلِ طوطی ہی کے رہتا ہے مرا گویا دل  
 ضعفِ پیری سے بقا راہ کا کٹنا معلوم  
 قدمِ خفہ نہ جاگا تھا کہ اب سویا دل

نہ دبے لب کی جو تقریر تلے شیشہ، تُل  
 آج شب اتنی پلائے کہ بہک کر ساقی  
 .... مے مجھے ایسے سے نہ دے پیرِ مغاں  
 تیرے دیوانے کو ہاں ہاں ہوں .....  
 تیری آنکھوں کے تو بیمارِ ادب سے ساقی  
 طفلِ قاضی سے ہو ہم چشم، تو غالب ہے کہ لے  
 یوں مے اُس چشم سے بہکے ہے کہ —  
 گردنِ وسینہ ہے یوں اُس —  
 میرے گھر چل تو وہی تجھ کو پلاؤں زاہد  
 لے بہ اندازِ نگہ تیرے تلے شیشہ، تُل  
 لب پہ یوں شمع کو، گلگیرِ تلے شیشہ، تُل  
 .... مے ناب کی تاثیرِ تلے شیشہ، تُل  
 کہ مبادا پہلے زنجیرِ تلے شیشہ، تُل  
 وقتِ قارورہ نہ لیں کیرِ تلے شیشہ، تُل  
 موجِ مے درہٴ تعزیرِ تلے شیشہ، تُل  
 — اُس کی ہو تصویرِ تلے شیشہ، تُل  
 جیسے ڈھانکے کوئی زنجیرِ تلے شیشہ، تُل  
 نکلے حدت سے جو مے چیرِ تلے شیشہ، تُل



باسرود و نالہ تھا شب کو دل سوزاں مرا

بزمِ عشرت میں تری، غیرتِ فزلی چنگ و شمع  
شمع رو دنیا کے، عاشق ہیں قباے تنگ پر

کچھ بھی نسبت ہے بھلا یا رو، قباے تنگ و شمع  
وہ چہرہ بغیر گر روشن کرے شمعِ حرم

نسبتِ طور و تجلی دے میانِ نگ و شمع  
بقا.....

رہ نماے شب ہے کافی ایک پیش آہنگ و شمع

گل کو ہے بلبل سے مگر قصدِ جنگ  
غنجے کے ترکش میں بھرے ہیں خدنگ  
لافت زنی حُسن کی کر یا ر سے  
غنچہ صفت مجھ کو نہ لائے بتنگ  
بارِ الہا، کہیں جاوے نگل  
یونسِ نسرین کو خزاں کا نہنگ  
آتشِ رخ سے تری لے شمع رو  
جل گئے ہم سے کئی ہو کر پتنگ

دل پہ مرے عشق ہے اب پنجہ زن

دیکھ بعتِ کشتی بازو کلنگ

ساتھ غیروں کے جو دیکھا تجھ کو پیٹے بل کے گل  
صبر کے دریا کا توڑا چشمِ تر نے پل کے گل  
حاجتِ سیرِ حرم پھر کیا ہے، جب وقتِ خرام  
ہوں شگفتہ تیرے ہر نقشِ قدم سے گل کے گل  
دل کو لائق ہے بہ رنگِ شانہ آن لہو سے شغل  
وہ خیم گمیوں ہوں گوگردِ شاغل کے گل  
ہاتھ کا تیرے فلک، ہر چند ناخن ہو ہلال  
تو بھی کھلنے کے نہیں عقدے مری شکل کے گل

کر چکی تھی جو ہر آئینے کا وہ تیغِ نگاہ

گر نہ آجاتا بقا عکس آگے اُس قاتل کے گل



بسکہ خونخوار ہے، رکھتا ہے ملا کر صیاد  
کشتہ کرنے کو ہے مس غم کی یہ آتش کے عوض  
دہن زخم سے پنچیر تلے شیشہ مل  
جام کے بوتہ اکیر تلے شیشہ مل  
ہم بقا رند ہیں، گر ہو ویں مرید زاہد  
تو رکھیں توڑ کے اس پیر تلے شیشہ مل

کر کے باتاب نگہ یاں تن و آتش کو بہم  
مجھے کچھ ربط نہ تھا تجھ کو، مگر شکل چراغ  
ربط مرثاگاں سے نہ دے دہن و آتش کو بہم  
عشق نے جمع کیا روغن و آتش کو بہم  
کیونکہ اس دل میں رکھوں خرمین و آتش کو بہم  
اس تپ دل سے رکھوں خرمین و آتش کو بہم  
اشک سے سرد کر اس آہن و آتش کو بہم  
ایک ساپا کے ترے تون و آتش کو بہم  
تجھ سے پا دل میں مرے امین و آتش کو بہم  
لاگ ہے کچھ مرے اس مسکن و آتش کو بہم  
تو رہا ربط مری گردن و آتش کو بہم  
کیا تناسب ہے رخ روشن و آتش کو بہم

کر کے باتاب نگہ یاں تن و آتش کو بہم  
مجھے کچھ ربط نہ تھا تجھ کو، مگر شکل چراغ  
اشک آنکھوں کو فناں لب کو، سخن لہو ہلا دکن  
دانہ اڑ جاوے چٹک تن سے، جو یوں سینے میں  
آتش دل سے ہوئی گرم وہ پکیاں، اے حتم  
گرم جولاں یہ ہوا آہ کہ ہم چھو نہ سکے  
محبوسوں نے کیا طور کا وہ جلاوہ نور  
بن چکا بس یہ ادھر، اور ادھر آہوں سے جلا  
شمع ساں سر سے لگی یوں کہ کٹا یا جب سر  
رخ افروختہ اپنا نہ سمجھ ثانی شمع

کیوں زباں سے نہ جلاوے تری چھاتی کو رقیب  
حکم واحد ہے بہت دشمن و آتش کو بہم

اُس لب سے ریش نہ چوسے قدح اور قدح سے ہم  
تو کیوں ملے سبوسے قدح اور قدح سے ہم



ساتی نہ ہوئے پاس، تو کب جرّے شراب  
 شیشے کے لے گلو سے قدح، اور قدح سے ہم  
 باقی ہے نہ بادہ، تو اُس کے عوض میں آب  
 لے خم کی شست و شو سے قدح اور قدح سے ہم  
 گردش پہ تیری چشم کی بحث ہے ہم سے یار (ق) دعوے کی گفتگو سے قدح اور قدح سے ہم  
 چشم اپنی ٹاک دکھا دے اُسے تو کہ آوے باز  
 اس بحث دو بدو سے قدح اور قدح سے ہم  
 بوسہ تیرے دہن سے بہ ہنگام مے کشی  
 لے ہے کس آرزو سے قدح اور قدح سے ہم  
 پاتے ہیں میکرے میں بفتا نعمت شراب  
 خم سے سبو، سبو سے قدح اور قدح سے ہم

یار کے نقشِ آستاں ہیں ہم  
 مٹ گئے جب، تو پھر کہاں ہیں ہم  
 تیغ رانی ادھر بھی اے صیاد  
 کیا ہوا صیدِ نا توں ہیں ہم  
 شمع ساں اشک و آہ سے اپنے  
 آب و آتش کے درمیاں ہیں ہم  
 شبِ فرقت میں یار کی ہر چند (ق) درپے نالہ و فغاں ہیں ہم  
 نالہ بے اثر یہ کہتے ہیں  
 مرغِ گم کردہ آشیاں ہیں ہم  
 اے بفتا وقتِ نزع ہے، مل لیں  
 جب مندی آنکھ، پھر کہاں ہیں ہم

کیونکر بھلا رواں نہ ہے میری جوئے چشم  
 ہے اشک سے مدام جواب آبروئے چشم  
 اُس خاکِ آستاں کو کریں سرمہ بصر  
 اے مردماں! یہی ہے مری آرزوئے چشم  
 حیراں ہے تب سے غنچہ نرگس، بصد زباں  
 جب سے سنی ہے یار تری گفتگوئے چشم



تڑپے بہت، پہ جانبِ صیاد آخر شش  
تربے صورتیں جو پیشِ نظر تھیں، سوشل شک  
پاکر شفا بنفشہ خط سے وہ انکھڑیاں  
مانا نہ ترکِ چشم نے، آخر کیا ہی قستل

قلاپِ عشق کی کششیں ہم کو لائیاں  
یوں گم ہوئیں زمیں میں کہ ڈھونڈھے نہ پائیاں  
صحت کے دن بھی خون گمیرے نہائیاں  
ہر حیدر دل نے دیں ترے لب کی دہائیاں

دکھیں بقا کہ ہجر کے آئے پہ کیا بنے  
اپنے تو ہوش اڑ گئے سن سن ادائیاں

قابلِ شکوہ یہ اپنی ہی زباں ہے، کہ نہیں  
معجزِ حسن تمھارے سے، بھلا کوہِ سریں  
ٹمک تو اندازِ تبسم بھی کہ اے غنچہ دہن  
یہ معین ہے کہ نکلے گا وہیں اس کا سراغ  
زلف میں اُس کی، صبا! سلسلہ جنباں ہو کر  
ہے یقین یہ تو مجھے ذبح کرے گا قاتل  
امتحانِ حسرتِ دیدار کا کرنا ہے تو پھر  
یہ مرارِ نختہ، رشکِ غزلِ سودا ہے

گلہ جو رترا، ورنہ کہاں ہے کہ نہیں  
موسے آویختہ، اے موکراں ہے کہ نہیں  
کوئی کیا جانے گا تنگی سے، وہاں ہے کہ نہیں  
ورنہ اپنا دلِ آوارہ کہاں ہے کہ نہیں  
جا کے آواز تو دیجو، کوئی یاں ہے کہ نہیں  
پر کوئی دم کے لیے جی کی اماں ہے کہ نہیں  
دکھیو، دیدہ بسملِ نگران ہے کہ نہیں  
لیکن اُس پر بھی بقا کو یہ گماں ہے کہ نہیں

بس مجھی کو نظر آتا ہے یہ یوں بے حرم (کذا)  
تم بھی ٹمک دکھیو صاحبِ منظران ہے کہ نہیں



کیا جانے کس کے ہوں گے یہ گیسو و بالِ دل      کس صاحبِ نظر کا یہ خط ہوگا مویے چشم  
 زکس کی طرح یہ بھی مبادا مریض ہو      آئینہ بار بار نہ رکھ رو بہ رو سے چشم  
 سرے سے اُس کی چشم ہے گویا، مگر بہت  
 مقدورِ سرمہ نیست کہ بند دگلوے چشم

یہاں لگیں ہیں اُن کو تو دیر و حرم بہم      جو پوچھتے ہیں دل میں خدا و صنم بہم  
 دیکھا تو ایک شعلے سے اے شیخ و برہن      روشن ہیں شمع دیر و چراغِ حرم بہم  
 بار یک میں دہن سے تھے وقتِ خندہ یار      کرتے ہیں دیدِ ہستی و سیرِ عدم بہم  
 ناصح! نہ ہم تری، نہ ہماری سُننے کا تو      کیا فائدہ جو بحث کریں دوا صم بہم  
 خرمستیوں پہ محتسب آتا ہے، چل بقا  
 باندھیں ہم اس حمار کے دونوں قدم بہم

مے چُرا، زاہد مجھے کہتا ہے، مے بھر دیں گے ہم  
 بھیجو مسجد میں اُٹھا اک شیشہ لا دھریں گے ہم

جب میرے دل جگر کی طلسمیں بنائیاں      بسرینِ آبِ اشک کیں آنکھوں کی کھائیاں  
 دستِ حنا سے پھوٹ بہا آخرش کوخوں      کیں پنچہ کر کے تجھ سے جو زور آزمائیاں  
 اُس آنکھ سے جب آنکھ ملائی، تو بحر نے      چشمِ صدف میں موج کی پھیریں سلائیاں  
 کس فتنہ زمین سے یہ رہتا ہے شب و چار      اُڑتیں ہیں آسماں کے جو منہ پر ہوائیاں  
 اُس شمعِ روئے، اپنے شہیدوں کی، جوں تنگ      گرنے نہ دیں زمین میں لاشیں، جلائییاں  
 اس قند لب کی دید سے، ان پتلیوں کو، مور      کھاویں گے زیرِ خاک، سمجھ کر خطائیاں



سیلاب سے آنکھوں کے رہتی ہے خرابے میں  
 اس چشم کے ساغر میں، اے ساقی غم بھر دے  
 ہر صبح ترے در پر، کس جرم سے لاتے ہیں  
 پتلی مری دیکھ اس کو، یوں دل کو جلاتی ہے  
 مت قتلِ مغاں کر کر، میخانہ کرو ویراں  
 اب فکر بقاء تیری رکھتی ہے جو چالا کی  
 سو چال نہ دیکھی میں مرکب دو رکابے میں

جو جہاں کے آئینہ ہیں دل انھوں کے سادہ ہیں  
 قتل سے عاشق کے تو نے اتنے کھائی ہے قسم  
 کل کے دن جو گردے خانے کے پھر تھے خراب  
 بند میں مطلق جو مجھ کو خطرہ صیاد ہو  
 راہ پیمایانِ تسلیم عدم سے یادگار  
 دل میں جادینے کو وہ ہر ایک کے آمادہ ہیں  
 آخر اے قاتل یہ باتیں پیش پا افتادہ ہیں  
 آج مسجد میں جو دیکھا، صاحبِ سجادہ ہیں  
 ہوں اسیرِ دام، پر وضعیں مری آزادہ ہیں  
 دامنِ صحرا میں اب باقی نقوشِ جادہ ہیں  
 چشم ساقی کی لیے ہیں تیغِ ابرو و دوش پر  
 لگ نہ چل ان سے بقاء، یہ ترکِ مستِ بادہ ہیں

کیوں نہ مرغِ چمن اُس کا ہونشہ دامن  
 ہیں رگِ گل سے مرے یار کے تارِ دامن

لے ن : سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں  
 لے ج : ہے کندہ خطِ باطل مسجد کے کتابے میں



تو ہے گل پیرہن، اور ہم ہیں غبارِ دامن  
 اشک نے چشم کے دریا میں جو کی طغیانی  
 گھیر دامن کا ترے دامنِ زیر پر دیکھا  
 مردہ مت جانیو بلبل کو چین میں گلچیں  
 جو مری آہ سے واقف ہیں سودہ گردوں کا  
 جی دھڑکتا ہے نہ ہو دیں تم سے بارِ دامن  
 آ لگی موجِ گہر تا بہ کسارِ دامن  
 کھب گئی چشم میں دامن سے بہارِ دامن  
 مشت پر ہونے کو بس ہیں تم سے خارِ دامن  
 شفقِ شام کو سمجھیں ہیں شرارِ دامن  
 چاک سے دستِ جنوں کے تو نہ دیکھا ہرگز  
 ایک حالت پہ بقا اپنا قرارِ دامن

تجھ سیہ چشم سے امتیازِ وفا جو رکھیں  
 چشم گویا ہے بتوں کی، یہ عجب معجز ہے  
 قتل سے کیوں میں ڈروں، بات یہ کتنی ہے قریب  
 یارِ آخر ادھر آئے گا، بھلا بہرِ نشانہ  
 بوسہ لب سے دوا بھی ہو کچھ اس کے ہمراہ  
 ہو ہے گا یہ کبھی ابرِ مرثہ سے سرسبز  
 چاہیے اشک سے پہلے ہی وہ منہ دھو رکھیں  
 سرمہ بھی دیویں اور آنکھوں کو سخن گو رکھیں  
 گرچہ اک تیغ کی جا موکراں دو رکھیں  
 صدفِ چشم سے ہم کچھ تو گہر رو رکھیں  
 دیں بتاں درد، تو یوں دیویں نہیں تو رکھیں  
 مزرعِ دل میں تو ہم تخمِ امل بو رکھیں  
 مفت برکتے ہیں یہ شوخ، بقا میں جو کہا  
 دل کو رکھتے ہو، لگے کہنے کہ لا تو رکھیں

ساتی کو دونوید، بہارِ آئی باغ میں  
 سوئے نے پھر کیا ہے خللِ سادِ باغ میں

لہ مج : تارِ دامن  
 لہ ک : ساتی کو پھر نوید  
 لہ مج : شفقِ شام سمجھتے ہیں  
 لہ گ : شاک : پھر خلل سا کیا ہے



بلبل کے اشکِ سرخ کی پروا ہے کب اُسے  
 رکھتا نہیں ہے سوزِ محبت اگر پتنگ  
 انصاف دشمن ایک مرایا رہے تو ہر  
 دل کی سی اپنی کہیو تو اے گل کہ کیا ہے فرق  
 ساقی بغیرِ مے کے بدل، اب چمن کے بیج  
 اب تو قبولِ قیدِ محبت کا نام ہے  
 کب کب بقا شگفتہ تھا حالِ فراغ میں

راستی پر ہم سے کس دن آئیاں  
 مرحبا، رو رو کے لے ابرِ مرزہ  
 سنگ مارا سر سے اور سرِ سنگ سے  
 باغ میں اے ساقی غنچہ دہن  
 غنچہ ہر گل ہے خمیانے کے بیج  
 یار کی زلفیں جو ہیں بل کھائیاں  
 روزِ ساون کی رتیں دکھلائیاں  
 سرِ نوشتیں جب مری دکھلائیاں  
 جب سے کہیں ہیں تو نے زلف آرائیاں  
 تاک لیتا ہے پڑا انگڑائیاں  
 جل کے خاکِ تر ہوا غم سے بقا  
 اے میاں! اتنی بھی بے پروائیاں

آہیں افلاک میں مل جاتی ہیں  
 صورتیں آبلہ ہائے دل کی  
 صیبرِ بھل کی نگاہیں صیاد  
 نگہیں یار کی جوں تا رہِ رفو  
 پوپلے زاہدوں کی کھاتے وقت  
 محنتیں خاک میں مل جاتی ہیں  
 خوشہ تاک میں مل جاتی ہیں  
 تیرے فتراک میں مل جاتی ہیں  
 جگر چاک میں مل جاتی ہیں  
 ٹھوڑیاں ناک میں مل جاتی ہیں



تھلکیاں دل کی بقا دیکھوں گی (کذا)  
زخم کا واک میں مل جاتی ہیں

غیرت گل ہے تو، اور چاک گریباں ہم ہیں  
ناتواں چشم تری، ہم ہیں عصا کے محتاج  
ریشک طوطی ہے خط سبز ترا، ہم گو یا  
آج کل ہائے تمے ناز کے ہاتھوں لے یا  
لالہ رویوں کی محبت میں اب لے سرو سہی  
ہم اسیر خیم موتیرے، ہمارا تو رام  
تو سخن سنج بقا، نام ہمارا مشہور  
خاتمِ جم ہے ترے پاس، سلیمان ہم ہیں

بلبل سے کہا گل نے، کر ترک ملاقاتیں  
غنجے نے گرہ باندھیں جو گل نے کہیں باتیں

یہ گل اندام جو صرف سے ٹکاک ناز کریں  
کام لیں زلف سے، کاکل کو بیس انداز کریں

دکھا کے طولِ شبِ جدائی، خدا نے ڈالا ہیں قفس میں  
ابھی تو شب ہے، سحر کہاں کی، سحر جواب ہو تو سو برس میں

عشق نے منصب لکھے جس دن مری تقدیر میں  
داغ کی نقدی ملی، صحرا ملا جاگیر میں







میں ہوں میخوار اس چمن کا، میرا سر ایک استخوان  
 صید ہونے سے ہیں اپنے یہ مطلب کے کہ پوست  
 بعد مرگ، اے کاش نخل تاک کا پیوند ہو  
 ہو جدا تن سے، ترے فتراک کا پیوند ہو  
 خشک ہو، زاہد! تری تاثیر زہد خشاک سے  
 اب جو طوبیٰ میں تری مسواک کا پیوند ہو  
 ہے بقا ہر جاشگاف ان میں، مگر یہ نختِ دل  
 زخم ہائے دیدہ نم ناک کا پیوند ہو

نہ مے زخمِ دلِ نازک پہ حکمِ نجیہ مرگاں کو  
 نہ ہو جاں بر تری بیمار آنکھوں کا، دمِ آخر  
 کرے کب سوزنِ عیسیٰ رفو گُل کے گریباں کو  
 چو اے خضر بھی گرم نہ میں اُس کے آجپاں کو  
 تہم زیر لب پہناں نہ ہو زخمِ نسا یاں کو (کذا)  
 کیا ہے سرنگوں اعجاز سے چاہِ زخداں کو  
 اڑیں اگلے، اگر جھاڑوں غبار آلودہ داماں کو  
 بچھا کر زہر میں جب تک دے لیں آبِ پکیاں کو  
 کماندارانِ ابرو کب کریں ہم کو ہفت اپنا  
 بقا! وہ نالہ پر تیج و تاب اپنی ہوا قسمت  
 کہ جس نے چرخ پر رکھا سدا اس چرخ گرداں کو

کس لیے اے شمعِ روا! پھر وہ ترا پروانہ ہو  
 کیا کریں آزاد ہو بندِ نفس سے ہم اسیر  
 جو جلے پروانہ وار، اور تجھ کو کچھ پروانہ ہو  
 رشتہ اُلفت سے گر صیاد کے، پر، وانہ ہو  
 ہے تندرنب، جب تلک یہ عقدہ ہم پروانہ ہو  
 ہم سے، یا اغیار سے، اور تجھ کو ابرو پر گرہ



جلوہ گر ہے یار اور سوتا ہے یوں غافل رقیب  
کیا گنہ خورد شید کا، گر چشمِ شیر دانہ ہو  
اب بقا، ایسی پڑی غم کی گرہ دل میں کہ یار  
ناخنِ ابرو سے اُس کو وا کرے، پر دانہ ہو

جو گریہِ مدام کی آنکھوں کو خو نہ ہو  
ہرگز نمازِ عشق کی نیت نہیں درست  
قانع ہوں رنگِ زرد پہ اپنے، وگرنہ یاں  
رخ اس کا دیکھ، آب جو ہو جائے اُننہ  
مخفل میں دل جلوں کی مجھے آبرو نہ ہو  
جب تک کہ تازہ خونِ جگر سے وضو نہ ہو  
ہے کون وہ کہ زر کی جسے جہت و جو نہ ہو  
نخلت سے پھر دوبارہ کبھی رو بہ رو نہ ہو  
مرزاں کو ساتھ لے نہ گریں اشک کیوں بقا  
کس کام کا وہ دُرِ نجف جس میں مو نہ ہو

قتلِ عشاق کرو، تم سے تو ہاں یہ بھی ہو  
یار بگڑے، تو نہیں کینِ رقیباں سے خطر  
بے وفائی کا تو کیا ذکر ہے یاں خیرِ وفا  
خلطِ غیر میں تو مجھ سے اشارات نہ چھوڑ  
سر سے موجود ہیں ہم، کاش میاں یہ بھی ہو  
ظلم لاکھوں ہیں جہاں، ایک وہاں یہ بھی ہو  
یہ تعجب نہیں کہ تم کو گساں یہ بھی ہو  
ہے ظاہر میں تو وہ چال، نہاں یہ بھی ہو  
ہیں جہاں لاکھ ہدف، ایک نشاں یہ بھی ہو  
گر وہ چل نکلتے، تو پیچھے سے رٹاں یہ بھی ہو  
گو مرے دل کی طرح دشمن جاں یہ بھی ہو  
عرضِ احوال میں آج اپنے، بیاں یہ بھی ہو



طلبِ غیر کے دم اُس نے بقا کو نہ کہا  
کہ مری بزم میں حاضر ہو فلاں، یہ بھی ہو

سرو کی لافِ بلندی کس سند پر راست ہو  
خاک بستر، نشتِ بالیں، بس ہر دم کو دہریا  
تدخیم کیا دیتا پشتِ آہ کو دل میں شکست  
بندہ ہو قد کا ترے پاس ادب ہے کھڑا  
چشمِ کج ہیں میں نہ ہو جاگو کہ اُس شمشاد کو  
کیوں نہ اس اک حد سے روشن ہوں سب درِ خلق (کذا)

سن بقایہ ریختہ اب شاعرانِ کج نہاد  
کیوں نہ بیٹھیں سندِ بغض و حسد پر راست ہو

میری گو آہ سے جنگل نہ جلے، خشک تو ہو  
پاک کرتے ہوئے گراشک مرے دامن کا  
نئی اشک کے باعث جو مری آہ سے رات  
مہروش! حسن کی گرمی سے تیرے وقتِ عرق  
ساقیا موسمِ گل بے مے و مینا، جو مری  
شعلہ رونت کی سواری میں سببِ گرمی کے  
ہوا گرمیہ دلِ سوزاں تیرے قلبیاں کی چلم  
ہاے اے آتشِ دل اب سے گرمی سے جلا (؟)  
طفلِ بد خو ہے مرا اشک، خدایا اس کی

اشک کی تفت سے گو جل نہ جلے، خشک تو ہو  
نالہ گرم سے آنچل نہ جلے، خشک تو ہو  
زیرِ رخ تکیہ محفل نہ جلے، خشک تو ہو  
تن پہ گر نیمہ ممل نہ جلے، خشک تو ہو  
آہ کی برق سے بادل نہ جلے، خشک تو ہو  
زیرِ راں گو ترے کوتل نہ جلے، خشک تو ہو  
آپ نے سے جو یہ نرسل نہ جلے، خشک تو ہو  
چشمِ ترکِ مری چھا گل نہ جلے، خشک تو ہو  
گو بہ خرمن ہوئی کو نیل نہ جلے، خشک تو ہو



غرق ہے اشک میں گھر تجھ سے ابے نالا گرم گومرے سکھ کا یہ منڈل نہ جلے، خشک تو ہو  
 اشک سے خامہ ہے جو مرے بس میں نہ بقا  
 گو تب تن سے یہ بھل نہ جلے، خشک تو ہو (کذا)

کس نے چمن میں رنجہ کیا عند لیب کو غنچے ہے ہیں دانٹوں میں داب اپنی جریب کو

تو نے اس طرح سے لے چرخ گرایا ہم کو کہ موئے پر بھی کسی نے نہ اٹھایا ہم کو

شب گزری اب لے سحر کے نالو پھر چرخ پہ بر چھیاں سنبھاو  
 گرفتار کیا بفتا کو خواباں اس بات کو منہ سے مت نکالو  
 پنہاں ہی بھلا ہے خونِ عاشق جانے دو اب اس پہ خاک ڈالو

صاف جی کر کے ملا تجھ سے ہزار آئینہ رخ مرے یار کا دیکھے، تو کسی صورت میں  
 سادہ رو اپنے تئیں دے نہ قرار آئینہ زلف گر رخ سے اٹھا کر وہ کرے تجھ پہ نگاہ  
 روز روشن ہو، یہ تیری شب تار آئینہ مت حباب اس کو سمجھو، کہ سدا رکھتا ہے  
 تیرے ہاتھوں سے دلِ آبلہ دار آئینہ تو وہ خود بین مری جاں، کہ ہر اک ان کے پیچ  
 دیکھ لیتا ہے اٹھا کر دو سہ بار آئینہ

اس زمیں میں غزل اکا در کہوں شستہ و صاف

جس پہ سوجان سے ہو جاوے نثار آئینہ



خوبرو جو ہیں، اُنہیں پشت سے یار آئینہ  
 کیوں نہ حیران رہے باغ میں بلبل، جس کو  
 صحبت زلف و رخ یار میسر ہے تجھے  
 میں ہوں اے دل اسی حیرت میں کہ کس صورت سے  
 کہ تو چھب دیکھے ہی، کہ چہرہ، تم سے ہاتھوں سے  
 دور کر خط کو، جو باقی ہے چہرے کی صفا  
 جس گھڑی ہو ترے کھڑے سے دو چار آئینہ  
 چہرہ گل سے دکھاتی ہے بہار آئینہ  
 خوش گزرتی ہے تری یل و نہار آئینہ  
 صحبت اُس یار سے کرتا ہے برآر آئینہ  
 ایک جاگہ نہیں رکھتا ہے قرار آئینہ  
 ہے یہ بہتر کہ ہو بے نقش و نگار آئینہ  
 شعر صاف ایسے ہی کہ اور بقا طورِ غزل  
 جیسے زجاجِ حلب کرتے ہیں یار آئینہ

رشکِ گلشن ہے ترے عکس سے یار آئینہ  
 ڈرتے آتے ہیں ترے تیرنگہ سے مردم  
 میری آہوں نے کیا تیرے دلِ سخت کو آب  
 اشک فی الفور بھرا دیں گے تری آنکھوں میں  
 کیوں نہ منصور کہوں اُس کو کہ نت رہتا ہے  
 دعویٰ تیز دوی کل تئیں کرتی تھی صبا  
 تو یہ سمجھے ہے کہ ہے باغ و بہار آئینہ  
 یازرہ پوش ہو، یا باندھ کے چار آئینہ  
 بارے، یہ سنگ ہوا آخر کار آئینہ  
 بھر نظر دیکھو مت صورتِ یار آئینہ  
 عکسِ مرنگاں سے ترے، بر سرِ راز آئینہ  
 آج بازی ترے گلگوں سے وہ ہار آئی نہ  
 اک غزل اور پڑھا ایسی کہ بقا محفل میں  
 حیرتِ اشخاص سے کر دیوے دو چار آئینہ

چشمِ مست اُس کی سے ہے اب تو دو چار آئینہ  
 تجھ کو کرتا ہے، ترا عکس دکھا کر بے تاب  
 آخر ان باتوں کا کیسے کا خمار آئینہ  
 اب تو پرے ہی میں کھیلے ہے شکار آئینہ



حیرتِ حسن نے اُس شوخ کی، مارا ہے جسے اُس کا لازم ہے کریں بوجِ مزار آئینہ  
 گر اسی طرح کرے کشتہ حیرت اپنا (ق) دم بہ دم تجھ کو دکھا کر رُخ یار آئینہ  
 پس یقین ہے کہ ملکِ نامہ اعمال کی جا لامرے ہاتھ میں دیں روزِ شمار آئینہ  
 گر یہی اشکِ فشانہ ہی، تو ہم آنکھوں سے کر دکھا دیں گے تجھے جیب و کنار آئینہ  
 مت اسے چار غزل کہ، کہ صفائی سے بقا  
 جسم پہ ہے یلِ معنی کے یہ چار آئینہ

چھپ کے نظروں سے، ان آنکھوں کی فراموش کی راہ  
 اب جو آتا ہے کبھی دل میں تو وہ گوش کی راہ  
 آگے، جوں اشک وہ رہتا تھا سدا پہلو میں  
 کیوں اب اُس طفل نے گم کی مری آغوش کی راہ  
 کیونکے پونچھے گا وہ آکر مرے آنسو ہیہات  
 کوچے سب اشک سے گل ہیں، نہیں پاپوش کی راہ  
 بھر سفر نامِ جیوں گا ترا، تو راہ کٹے  
 یوں تو طے ہوگی نہ اس رہِ رخاموش کی راہ  
 پھوڑ کر کوچہ میخانہ، طرفِ مسجد کے  
 میں تو دیوانہ نہیں ہوں جو چلوں ہوش کی راہ  
 یوں تو آتا نہیں، اے کاش مرے گھر کوئی  
 پھیرے نشے میں غلط اس بتِ مے نوش کی راہ

۱۵ ج : کہ صفا سے یہ بقا۔

۱۶ ج : جسم اوپر یلِ معنی کے ہے چار آئینہ۔



ڈس گئیں ہاے مرے دل کے تئیں آج بھتا  
ناگنیں زلف کی اُس سر سے اُتر، دوش کی راہ

چشمِ تر جام، دلِ بادہ کشاں ہے شیشہ  
بزمِ ساقی میں جو آواز نہیں قفلِ تل کی  
مختبِ ننگ لیے ہاتھ میں اور سوے فلک  
پانور کھتا ہی نہیں ناز سے بالائے زمیں  
مختبِ آج کدھر جام، کہاں ہے شیشہ  
اس قدر آج یہ کیوں پنبہ دہاں ہے شیشہ  
دم بہ دم چشمِ دہن سے نگر اں ہے شیشہ  
کف بہ کف بزم میں ساقی کی رواں ہے شیشہ  
ہے ترا دوش میں بقا اس سے عجب نابِ سخن  
ہے بجا کیے اگر، اپنا دہاں ہے شیشہ

پیوند ہوا ایسا رخ سے خطِ جانانہ  
آئے جو مرے گھر تم، کی راہ غلط کی دھر  
اے مختبِ ناداں جوں تاک نہ اینڈ اتنا  
ہر روز جو اے گلِ رو، بلبل ہوں، تو پھر شہر  
تھا یا رچمن گو یا یہ سبزہ بے گانہ  
بے وجہ نہیں پیارے بھولے ہو رہِ خانہ  
کھا جائے گا کیا مجھ کو، انگور ہوں بیدانہ  
ہوتا ہوں فدا تجھ کو، شمع بہ پروانہ  
اس بزم میں بے ساقی بیان ہے بیماں  
کرتا ہے خابندی انگشت میں اب شانہ  
دیوے جو بقا بوسہ وہ شوخ دمِ آخر  
تو آبِ بقا سے ہو پڑ عمر کا پیماں

لے ج : اپنی ۔

لے ن : پیوند ہوا رخ سے ایسا ۔



ہر نکتہ دل آنکھوں میں مرنگاں سے ہے پیوستہ اس ابر بہاری سے ہر خار ہے گلدرستہ  
 ان سنگدلوں کے اب ہاتھوں سے بچوں کیونکر میں بارغ محبت میں ہوں بلبل پر بستہ  
 از بس ہوں بقا شائق اس مطلع ابرو کا  
 آہ سحر میری ہے مطلع بر جستہ

جب سے خاتم ہے تری زیر نگین آئنے  
 چڑھ کے منہ پر تیرے یہ خجالت سے رویا ہر کہ یار  
 حید کرنے کو مرے صیاد کے کچھ ان دنوں  
 دل کو ظاہر میں کے کب دے کسی پر اعتقاد  
 سر نوشت اخفا ہی بہتر ورنہ کو رو سہنی (کذا)  
 صاف دل سمجھے ہیں الٹی قدر ہر سیت و بلند  
 پار کا عشق میں رکھ لو وہ ہو بیٹھا سوار  
 خود نہائی عیب خود بینی سے ہے محبوب تر  
 دیکھے کن آنکھوں سے وہ دل ہا حیراں کو خوش  
 مست دکھا چہرہ تو اپنا اس کو لے خورشید رو  
 چاشنی گر خدا بینی ہو تو ہرگز نہ پائے (کذا)  
 یوں ملی یہ مشت خاک اس آب گوہر کہ جوں  
 خود نہائے چشم میں وہ شوخ تو خود میں نہ دل  
 پر وہ آٹھنے پر بھی اٹھا ہی رہے جیسا کہ ہے (کذا)  
 ہونے جس دل کا یقین مشعل یقین آئنے

کنز (مخفی) کیوں نہ سمجھیں ہم بقا اپنی ہی ذات  
 کھل چکا ہے اپنی نظروں پر دین آئنے



نظر سے گم ہوں، ضعیفی سے میرا حال ہے یہ جو کچھ تو دیکھے ہے پیارے، ترا خیال ہے یہ

یہ رخ یا نہیں زلف پریشاں کے تلے  
گیا کریں، سینہ جو ناصح سے چھپاتے نہ پھریں  
آہ کی برق جو سینے میں چمکتی دیکھی  
دل میں آتا ہے، کروں، اے گل خنداں تجھ بن  
یوں نہاں داغ جگر آہ سے رکھتا ہوں کہ جوں  
شیخ، ڈرتا ہوں، کہیں بیٹھ نہ جائے یہ کنواں  
ہے نہاں صبح وطن، شامِ غریباں کے تلے  
داغ سے داغ ہیں کچھ اپنے گریباں کے تلے  
طفلِ اشک آہی چھپے دہنِ مرگاں کے تلے  
بیٹھ کر گریہ، کسی نخلِ گلستاں کے تلے  
باو سے شمع چھپائے کوئی داماں کے تلے  
مت کھڑا ہو تو عصارہ کے زخماں کے تلے

نہیں ملنے کی بقا ہم کو بجز گنجِ مزار  
جائے آسودگی، اس گنبدِ گرداں کے تلے

مت چمن میں جا، گلوں کے رخ سے رنگ اُڑ جائیں گے  
روے دے ناویدہ گل سب بید رنگ اُڑ جائیں گے  
چھوڑ اے گل چیں، چمن میں آسشیاں کا خار و خس  
آترے ہاتھوں سے اک دن ہم بہ تنگ، اُڑ جائیں گے  
گر خوارق سے اُڑے تم، تو تمھارے ساتھ شیخ  
ہم بھی چرخِ ہشتیوں تک، پی کے بنگ، اُڑ جائیں گے

اے گ: کیا کروں سینہ جو ناصح سے چھپائے نہ پھروں۔

سے ش: ک، سخ: آن چھپے۔

یہ گ: میرے۔

یہ گ: مراد۔



ہے یہی دورِ فسادِ طور، تو اہلِ دستار  
 سب کے سب گردش میں آکر مثلِ سنگ اُڑ جائیں گے  
 شب تو آدے گا مری مجلس میں، تو اے رشکِ صبح  
 شمع ہو جاویں گی گل، اور سب پتنگ اُڑ جائیں گے  
 مت اکیلا سو، کہ عاشق ہیں ترے جن و پری  
 لے کسی شبِ خواب میں تیرا پتنگ اُڑ جائیں گے  
 غیر نے قاصد نہ کر بھیجا ہمیں تجھ تک، کہ یہ  
 دستِ شل ہیں، لے کے خطِ باپاے لنگ اُڑ جائیں گے  
 مجمعِ زہاد ہے، پر رند کوئی سنگ سا  
 آ پڑا ان میں، تو سب مثلِ کلنگ اُڑ جائیں گے  
 خواب سے کھل چٹکیاں مرزاں کی اے ابرو کماں  
 غمزے تیرے صیدِ دل کو جوں خدنگ اُڑ جائیں گے  
 یہ تپیش ہے تو بختِ بانالہ آتشِ فشاں  
 ہم کسی شبِ چرخ پر مانندِ چنگ اُڑ جائیں گے

---

سیر میں تیری ہے بلبل، بوستاں بے کار ہے  
 بوستاں غیرت سے خود اُجڑا، خزاں بے کار ہے  
 چھوڑ کر آنسو کو، لختِ دل گیا ہمراہِ آہ  
 ناوِ خشکی میں چلی، آبِ رواں بے کار ہے  
 گہ زمیں سے بامِ بہر ہوں، بام سے گہ بر زمین  
 اس تپیش سے اپنے گھر کی زردباں بے کار ہے



آئی اب فصلِ گل ، اور مجھ عندلیبِ زار کا  
 ہے نشیمن شاخِ گل پر ، آشیاں بے کار ہے  
 یار سے اور ہم سے ، محفل میں ، بچا کر چشمِ غیر  
 ہے سخن ایما میں باہم ، اور زباں بے کار ہے  
 میرے ڈر سے تو نے بٹھلایا تھا در پر پاسبان  
 سو میں حسرت سے مولا ، اب پاسبان بے کار ہے  
 خلق کو مارے ہے چشمِ اُس کی ، معطل ہے قضا  
 فتنہ ہے اُس کی نگہ میں ، آسماں بے کار ہے  
 مانگتا ہوں بوسہ میں جس دم ، تو اُس دم یار کے  
 کار میں لب پر نہیں ہے ، دل میں ہاں بے کار ہے  
 کار فرما دیکھ کر غیروں پہ ، میں اُس سے کہا  
 کار ہے مجھ سے بھی کچھ ؟ بولا کہ ہاں ، بے کار ہے  
 اے بقائے کارواں ، اس ریختے کی ہر ردیف  
 گرچہ ہے بے کار ، پر بتلا ، کہاں بے کار ہے

ہم ناتواں دبیں جو سرانگشت کے تلے	جاویں بہ رنگِ مور مر ، انگشت کے تلے
آہستہ اے طیبِ صبا دیکھ نبضِ گل	بلبل کا دل ہے تیری ہر انگشت کے تلے
کیوں ہم جلوں کی راکھ دباتے ہو ہاتھ سے	آجائے گا کوئی شرر انگشت کے تلے
ملا جو چشم ، ہجر میں ، اٹھتا ہوں خواب سے	ٹوٹے ہیں اشک کے گہرا انگشت کے تلے



کرتا ہے ہاتھ سے ہمیں صیاد کب رہا  
 روتا ہے کیوں طلیب، مگر آج اپنی نبض  
 وہ طفل، نام عشق کا، آہستہ شرم سے  
 پھا ہا جو تو لگا دے کبھی میرے داغ پر  
 جب تک نہ لیوے داب پر انگشت کے تلے  
 دیتی ہے مرگ کی خبر انگشت کے تلے  
 پڑھتا ہے حرف ڈھانک کر انگشت کے تلے  
 مرہم دیں کرے اثر انگشت کے تلے  
 مطرب کا تارِ بین نہ سمجھو بفتا کہ یہ  
 ہے نغمہ زارِ رگِ جگر انگشت کے تلے

سپاہِ عشرت پہ فوجِ غم نے جوں کے مرکب بہم اٹھائے  
 ادھر تو نالے کا تاشا کرٹکا، ادھر فغاں نے علم اٹھائے  
 اس اشک و سختِ جگر سے ایک ہی نقطہ نہ مردم کو فائدہ ہے  
 جو در کے روئے عدد کسی نے، تو لعل کے بھی رقم اٹھائے  
 سببِ رقیبوں کے، بزم میں اب گئی وہ آپس کی ہم نشینی  
 ہم آن بیٹھے تو اٹھ گیا وہ، وہ آن بیٹھا تو ہم اٹھ آئے  
 تہی کف آئے تھے ہم عدم سے، چلے بھی یاں سے تو دستِ خالی  
 نہ توشہ داں سے لیا تھا زار کا، نہ ساتھ یاں سے درم اٹھائے  
 بقا جو راہی ہوئے عدم کے، تو وقفہ ہرگز کرو نہ دم کا  
 یہ راہ ہستی کی پُر خطر ہے، چلو یہاں سے قدم اٹھائے

۳ گ: چلے یہاں سے

۳ گ: چلے یہاں سے

۳ س: نہ توشہ داں سے یہاں تھا آیا۔



اس چہرے کی جب طرح رقم ہاتھ سے رکھ دی  
 کل شیخ پہ شیخ اُس نے تو کھینچی تھی، ولیکن  
 لا آگورے مے، مری تو بہ شکنی کو  
 کافوں یہ مصور نے قلم ہاتھ سے رکھ دی  
 بچھا لہ یہ بہ سید حرم ہاتھ سے رکھ دی  
 ساتی نے دلا اپنی قسم ہاتھ سے رکھ دی  
 نذر اُس نے بقا پہلے مرے دل کی اٹھالی  
 پر لے کے کیا پھر یہ ستم، ہاتھ سے رکھ دی

مجھے تو عشق میں اب عیش و غم برابر ہے  
 نہ کچھ ہے عیش سے بالیدگی، نہ غم سے گداز  
 چلا ہے قافلہ پر ہم سے ناتوانوں کو  
 بہ چشمِ مردم روشن ضمیر، گر ہو چھو  
 خزاں کے روز جو دیکھا تو عندلیبوں کو  
 بہت شگفتہ ہیں گلشن میں گرچہ لالہ و گل  
 یہ رندے گئے لقمہ تجھے تو غدر زمان (؟)  
 وہ مستِ ناز و ادا، جس کو روز وعدے کے  
 بقا جو بار نہ دے ہم کو اپنی محفل میں  
 تو مرگ و زندگی اپنی بہم برابر ہے  
 بہ رنگ سایہ، وجود و عدم برابر ہے  
 ہمارے کام میں سب نوش و ستم برابر ہے  
 ہزار گام سے اب اک قدم برابر ہے  
 تو قدرِ جامِ مے و جامِ حسم برابر ہے  
 صفیرِ بوم سے اب زیر و بم برابر ہے  
 تھارے چہرے سے یہ کوئی کم برابر ہے  
 ترا تو شیخ تنور و شکم برابر ہے  
 شکستِ جام و شکستِ قسم برابر ہے  
 بقا جو بار نہ دے ہم کو اپنی محفل میں  
 تو مرگ و زندگی اپنی بہم برابر ہے

جلوہ، تنک باغ میں، قمری، جو وہ شمشاد کرے  
 یزید و بنیاد جنوں تھی قدمِ مجنوں تک  
 مول لے کر ترے اس سرو کو آزاد کرے  
 کون اب خانہ زنجیر کو آباد کرے



یہی کاہش ہے جو غم سے تو پس از مرگ نہ شوخ  
 درسِ الفت میں ہے اُس زلف کا ہم سے سلوک  
 خاک بھی میری نہ پائے گا کہ بہ باد کرے  
 طفلِ مکتب سے جو کچھ سیلی اُستاد کرے  
 رشدِ باطن کی طلب ہے تو کر اے شیخ وہ کام  
 پیرِ مے خانہ جو ظاہر میں کچھ ارشاد کرے  
 غیر بے رحم یہ کچھ، یا رسول وہ پنہ بہ گوش  
 آگے اب کس کے بقا نالہ و فریاد کرے

خواب میں جب نظر آیا رخِ دلدار مجھے  
 کھول کر چشم جو دیکھا تو تھی ہے آغوش  
 طالعِ بد نے کیا رشک سے بیدار مجھے  
 وہیں حیرت نے کیا صورتِ دیوار مجھے  
 کیا کرے بخت جو اپنے میں نہ مئے اندام (کذا)  
 پہنچوں اس چشمِ ملک پر یہی جو کبھی (کذا)  
 چشمِ ساغر کی طرح یاد لبِ ساقی میں  
 روز و شب اب تو ہے گریے سے سرکار مجھے  
 ہوں میں اُس چشم کے ہاتھوں سے بقا سرِ بکام  
 رہے کس طرح بھلا طاقتِ گفتار مجھے

انگشتری چشم ہے کس کام کے لیے  
 دیکھا تو زینِ قصرِ فلک دارِ خلق میں  
 ہر بختِ دل نگیں ہو مگر کام کے لیے  
 ہر گز مکاں نہیں کوئی آرام کے لیے  
 اے عندلیبِ باغ میں صیادِ دہر کو  
 منظور پرورش ہے تری دام کے لیے  
 پھر دور دور، مت ہو گنہ گارِ عشقِ گل  
 فرصت نہیں ہے دیدِ دل آرام کے لیے  
 سودا کی طرح جیفِ بقا آجہان میں  
 کیا کر چلے اور آئے تھے کس کام کے لیے



عشق میں بوہے کبریائی کی      عاشقی جس نے کی، خدائی کی  
 ہمسری مرت صبا سے کر لے آہ      تو نے بھی کچھ گرہ کشائی کی  
 لے چلے ہم قفس سے اے صیاد      خاک میں آرزو رہائی کی  
 روز محشر تلک نہ آخر ہوں      داستانیں شبِ جدائی کی  
 شیخ جیو سے ہوئی نہ سرزد باو      چول بولی ہے چار پائی کی  
 جس میں یارانِ بزم ہوں مخطوط      یوں بقا میں غزل سرائی کی

تمیر بھی در نہ خوب کہتے ہیں  
 کاٹے جیب اُن کی دائی کی

مری چشم میں کیوں نہ خوناب اُترے      کہ دریا میں البتہ سرخاب اُترے  
 نہ تجھ کو کرے سرو آزاد قمری      نہ گردن سے یہ طوقِ سنجاب اُترے  
 بتاں، چشم سے دل میں، ہمراہ لے کر      جگر خون کرنے کا اسباب، اُترے  
 کوئی موج بھی تا بہ گردن نہ گزری      یہ دریا کئی بار پایاب اُترے  
 شعاعِ رخ اُس کی چڑھی یوں فلک پر      کہ جوں خاک پر نورِ مہتاب اُترے  
 بقا اور اک جامِ ساقی سے لے لو  
 کہ سر سے خمارِ مے ناب اُترے

کل مے کدے کی جانب آہنگِ محتسب ہے  
 در پیش مے کشوں کو پھر جنگِ محتسب ہے



ہوتا ہے شیشہ دل چور اُس کی گفتگو سے

یارب! یہ پندِ ناصح یا سنگِ محتسب ہے  
منہ سرخ ہو رہا ہے بیمِ معان سے اُس کا  
جو کچھ ہے رنگِ مینا، سو رنگِ محتسب ہے  
ازبس گراں ہے اُس پر میناے نے کی قلقل

پڑھنا بھی چار قُل کا اب رنگِ محتسب ہے  
ہرگز بقا نہ رہیو دورِ فلک سے غافل  
مستوں کی نت کیوں میں سرچنگِ محتسب ہے

جاؤں گا چمن میں دلِ نالاں کو بہم لے  
تسخیر کو جاتی ہیں جدھر اشک کی فوجیں  
ہے گریہ بلبیل پہ ترحم اُسے، ورنہ  
بس پائے جنوں، سیرِ بیا باں تو بہت کی  
افسوس کہ ہم رشک سے ہوں خاک برابر  
اور بوسہ کفِ پا کا ترے نقشِ قدم لے

یہ رنختہ جس دن سے بن آیا ہے بقا خوب  
یاروں نے تو کیا کیا نہ کیے تیرے حلے (کذا)  
الفاظ و معانی میں رہے رخنہ فگن یوں  
جس طرح کہ گلبرگ کے تسلیں .....

ترے مریضِ محبت کی نبض چھوٹ گئی  
رہے اسیرِ نفس اب کے سال بھی محروم  
ٹکٹ اک جو اُس تھی جینے کی، آج ٹوٹ گئی  
خزاں کی فوج، چمن کی بہار لوٹ گئی



تغیرِ حال مراد دیکھ کر، گجر بیٹھتے      شبِ فراق بھی چھاتی کو اپنی کوٹ گئی  
 بقا، یہ گریہ نہاں کب تلک رقیبوں سے  
 ستم ہے حق میں ترے گریہ بات بھوٹ گئی

مراد دل اب تو جوں شبِ غم بندھا ہے گل کے پتے سے  
 ڈرامت مجھ کو اے بلبل تو اتنا اپنے کلتے سے  
 کیا ہے خوں مرے دل کو حنا کی سادہ کاری نے  
 پنھائے پور پور آخر مرے ہاتھوں میں پھلتے سے  
 شکستِ دل پہ رندوں کی، عبرت تو شیخِ مرتا ہے  
 کوئی یہ قلعہ روئیں ترے ٹوٹیں گے ہلتے سے  
 نہ بچنے دے کوئی دانہ، نکالے چیر کر پہلو  
 بھرے بھی آسیا کا منہ کبھی گردوں جو غلے سے  
 بقا خاموش رہتا ہے، جو کھینچے ایک بھی نالہ  
 تو ننگے پانو ہمایے نکل بھاگیں محلے سے

رنگ میں ہم مس سے بتر ہو چکے      ایک اُسی مس سے کہ زر ہو چکے  
 رخ کو ترے شبے میں تشبیہ دوں      پر اُسی شب سے کہ سحر ہو چکے  
 چہرہ ترا ہے مہِ نوا اے صنم      پر وہ مہِ نوا کہ قمر ہو چکے  
 رشکِ گلِ سبب ہے تیرا زرخ      ایک وہی گل کہ نثر ہو چکے  
 قطرہ نیساں ہیں وہ دنداں بقا  
 پر وہی قطرہ کہ گہر ہو چکے



دل سے وہ نگاہ پیر گزری      پر شکر کہ جی کی خیر گزری  
 کیا فصل بہار کیا خزاں میں      اس باغ کی کرتے سیر گزری  
 محفل میں بتا تو کس طرح سے      اغیار سے ہم بغیر گزری  
 جیتی ہوئی ہم سے ہر سرزد      اتنی تمھیں کرتے پیر گزری  
 جانا ہی بھتا بھلا تھا دل کا  
 کچھ تیری اسی میں خیر گزری

ہاں میاں سچ ہے، تمھاری تو بلا ہی جانے  
 جو گزرتی ہے مرے دل پہ، خدا ہی جانے  
 دل سے نکلے کہیں پا بوسی قاتل کی ہو کس  
 کاش وہ خوں کو مرے رنگِ حنا ہی جانے  
 دل کی داشتہ پہ عبث آہ نے کھینچی تکلیف  
 کھولنے عقدے تو غنچوں کے صبا ہی جانے  
 روز و شب نزع میں ہے عاشقِ چشمِ دلِ یار  
 نہ تو جینا ہی وہ سمجھے، نہ فنا ہی جانے  
 ہم تو نت دور سے خمیا زہ کشِ حسرت ہیں  
 لذتِ بوس و کنار اُس کی حیا ہی جانے  
 تیرے بیمار کو کیا ہوئے شفا، جس کے طبیب  
 نہ تو کچھ درد کو سمجھے، نہ دوا ہی جانے



پوچھ اس دل سے جو ہے کاٹ ترے ابرو کا  
 جو ہر بڑبڑش شمشیر سپاہی جانے  
 اپنی مرضی تو یہ ہے بندہ بت ہو رہی ہے  
 آگے مرضی (ہے) خدا کی، سو خدا ہی جانے  
 طور پر اپنے سخن کون بُرا کہتا ہے  
 یہ یہ انداز جو پوچھو تو بقا ہی جانے

اب کہاں تاب، جو نالے میں کروں شوروں سے  
 سانس بھی آتی ہے لب پر تو بڑے زوروں سے  
 دیکھ احوال تو تک اپنے تو بیساروں کا  
 مردے گویا کہ اٹھ آئے ہیں ابھی گوروں سے  
 ہے ضعیفوں کا پے بوسہ ترے لب پہ ہجوم (؟)  
 حق تعالیٰ ہی بچا دے یہ شکر موروں سے  
 شکر بوسہ لب ہم کو نہ دے کیا طاقت  
 تاب ہے گل کی جو منہ موڑے شکر خوروں سے (؟)  
 جب ہوس ہوتی ہے فندق کی تو ملتے ہیں بتاں  
 مثلِ عتاب مرے نختِ حبگر پوروں سے  
 ہند خط چڑھ گئے سب اُس کے فرنگِ رخ پر  
 فوج کالوں کی جھٹی آن کے اب گوروں سے



دل دوں کس طرح بقا ہاتھ میں اُس غافل کے  
کف میں جو رنگ حنا رکھ نہ سکے چوروں سے

آکے ناصح جو مرالیں دریدہ کاڑھے  
تو نہاتا ہے جو دریا میں، تو آنکھوں کو تری  
تجھ سے خوبی میں ہوں ہمسرا تو مہر کو کیوں  
گل ہو پڑا مردہ تجھے دیکھ کے، تو تیرے لیے  
دل نکالوں گا ذقن سے تری یوں باقدِ خم  
مجھ کو شانے سے خطر ہے کہ پکڑ زلفوں سے  
دیکھوں اُس مہر کو گلشن میں تو عطسہ دو ہیں  
پھر مشیخت کی بھلا کیونکے لگا دے ٹنگی  
یا دل میں ترے یوں ہونٹوں پلاتا ہوں میں جھاگ  
تو سوئی لے کے وہ بھڑوا بھی کشیدہ کاڑھے  
بیٹھے تکتے ہیں صدت آگے دیدہ کاڑھے  
گوش و بینی نہ فلک کر کے بریدہ کاڑھے  
پھر کہاں سے وہ بھلا رنگ پریدہ کاڑھے  
چاہ سے دلو کو جوں کوئی خمیدہ کاڑھے  
دل کو میرے نہ یہ اب دست بریدہ کاڑھے  
گل کی آس سے مرے بوسے شمیدہ کاڑھے  
شیخ گریش سے اپنی نہ رفیدہ کاڑھے  
منہ سے کف جیسے کوئی مار گزیدہ کاڑھے  
صیت اشعار تری خلق سے تب کم ہو بفتا  
جب کہ گوشوں سے کوئی حرف شنیدہ کاڑھے

کہتا ہے دم بوسہ، چل دور کہاں کا ہے  
دکھ درد جو پھر کوئی تم حضرت دل لائے  
ہنتا ہے جو تو اپنے کمر در ضعیفوں پر  
ہیں دوست مرے لاکھوں پر ہا نہ ناصح سے  
سن غیب سے پرے سے آہ اُس کے ضعیفوں کی  
جب بام پہ توجا دے تو خلق میں غوغا ہو  
لے ہم سے، ترا ایسا مقدور کہاں کا ہے  
یہ حصہ بخت اپنا بھر پور کہاں کا ہے  
انبار میں تو ایسا شہ زور کہاں کا ہے (کذا)  
یہ دوست خدا جانے آخور کہاں کا ہے  
حضر کو ہے حیرت یہ شور کہاں کا ہے  
خورشید چھپا ہے گا، یہ نور کہاں کا ہے



اُس غور کے جلوں کا جو کافر کفن ہووے  
 دل نیم نگہ پر لے جاں مانگے ہے دستوری  
 حیراں ہے مسیحا بھی کچھ روگ میں اس دل کے  
 بادے میں تمے ساتی ہے زخمِ جگر کی بو  
 اس دل پہ کہ ہر ساعت اک تازہ تھلی ہے  
 جب ذکر مرا چھیرے کوئی، تو وہ کہتا ہے  
 فریادِ جگر تیری ہے سخت بہتا دل کش  
 یہ زیرِ بغل تیرے طنبور کہاں کا ہے

تربت میں میری آہ سے یہ زلزلے ہوئے  
 ساتی تغافلوں سے ترے، موسمِ بہار  
 جو دل لیے تھے زلف نے منہ مانگی شرط پر  
 بس آہ آتشیں کہ اب اُس در پہ داد خواہ  
 .....  
 بیٹھا ہے اب تو ہو کے یہ اڑیل، نہ جائے گا  
 رویا تھا بس کہ یہ دل آنکھوں سے شمع وار  
 تھے اور کی ہوس میں تو عاشق ہی سب برے  
 میرے تم سے جو رشک سے شبِ بزمِ مے میں یار (ق)  
 شمعیں عرق ہو شرم سے ہوتی تھیں سیل مے  
 تھے دبران و دشتِ گاہاں سب جلے ہوئے  
 پروانے سب کباب تھے گھر کے تلے ہوئے  
 ہتہ کر گئے تھے کوچہ قاتل میں ہم بہتا (کذا)  
 آئے نہ خاک و خوں میں وہاں سے لے ہوئے



جس کو کہتے ہیں یہ رہ رو جس محل ہے  
 موج سے بیش نہیں ہستی وہی کی نمود  
 محنت راہ سے نالاں وہ ہمارا دل ہے  
 کچھ تعین نہیں اس راہ میں جوں ریک وں  
 صفحہ دہریہ گویا یہ خط باطل ہے  
 آستین حشر کے دن خون بھری ہو جس کی  
 جس جگہ بیٹھ گئے، اپنی وہی منزل ہے  
 یہ یقین جانیو اس کو کہ مرا قاتل ہے  
 کھول دو عقدہ کونین بقا کے بل میں  
 یا علی تم کو یہ آسان، اُسے مشکل ہے

جدا کرنا ہو سر میرا جو ہر تقدیر گردن سے  
 جدا سر ہو گیا تن سے تو شمع آسا خاموشی میں  
 تو یوں مل مل کے پھر جاوے نہ وہ شمشیر گردن سے  
 جو دیکھیں خواب میں شب کو تری شمشیراے قاتل  
 کریں گے سوزِ دل اپنے کی ہم تقدیر گردن سے  
 مسخر طرہ شمشاد کی ایسی ہے گر قمری  
 تو پوچھیں صبح ہم دیوانگاں تعبیر گردن سے  
 تو اترے گانہ اس کی حلقہ، تسخیر گردن سے  
 قلم کا سر قلم کرتا ہوں میں اب قسط کے پردے میں  
 کرے تو اک غزل ایسی یہ پھر تحریر گردن سے

نہ گزرا تھا ہنوز اس کی دم شمشیر گردن سے  
 کہ ہاتھ لے یا ردھو بیٹھا ترا پنجر گردن سے

اے ہ، گ، د، ج؛ رہ رواں کہتے ہیں جس کو۔ س؛ جس کو کہتے ہیں مسافر۔

اے ج؛ یہ۔

اے گ؛ تعلق۔ ج؛ تیقن۔

اے س؛ آہ وہی۔ اے ہ، گ، د، ج؛ خون سے تر ہو جس کی۔

اے ہ، ج؛ یہ آسان ہے۔ ج؛ تم کو ہے آسان۔



سپید اے کوکھن یاں تاک ہوا تھا خون خسرا کا  
 یہ لیلیٰ وش مگر مجنوں ہیں اپنے ورنہ کس خاطر  
 گھلا ہوں شمع ساں، دامن مرا مت کھینچ اے ناصح  
 جو کرتا اس مسی آلودہ لبے نیلو فر دعویٰ  
 کٹا جوں خامہ سر، تو کیا ہے، نامہ اپنے قاتل کو  
 نہیں رعشہ سر زاہدیں، ہر دم مرگ کو اپنی  
 کہ بہتی اُس کے وقت ذبح جوئے شیر گردن سے  
 رکھیں پیوستہ کاکل کی سدا زنجیر گردن سے  
 گریباں سر کو لے اترے گا جوں گلگیر گردن سے  
 گزرتی اس کی موج آب جوں شمشیر گردن سے  
 کریں گے شکل بے سر خامہ، ہم تحریر گردن سے  
 اشاروں میں بلاتا ہے یہ مردِ پیر گردن سے  
 قسم معصوم دشتِ کربلا کی، یہ وہ دورہ ہے  
 بقا گر مانگیے پانی، تو گزرے تیر گردن سے

جو تم اور صبح اور گلنار خنداں ہو کے مل بیٹھے  
 تو ہم بھی اُن میں باچاکِ گریباں ہو کے مل بیٹھے  
 نہیں گھلتے جو لوں اُس شہد لب سے بوسہ ثانی  
 یہ لب یوں بوسہ اول میں چسپاں ہو کے مل بیٹھے  
 اڑادوں دھجیاں دل کی اگر ان میں سے کوئی بھی  
 قباے سرخ میں تیری گریباں ہو کے مل بیٹھے  
 یہ جزو ہمد گر ہیں اے کماں ابرو، عجب مت کر  
 جو دل تیرے سرِ ناک پہ پکیاں ہو کے مل بیٹھے  
 ابھی دل جمع ہے، اے شانہ کر جلدی سراغ اس کا  
 مباد اُس زلفِ مشکیں میں پریشاں ہو کے مل بیٹھے  
 سنا اے طفل جب مرادہ تری مکتب نشینی کا  
 یہ اجزائے دلِ سپارہ قرآن ہو کے مل بیٹھے



ہمارا رشک سے دل جل کے خاکستر ہوا یا قسمت

اور ان دایوں میں مستی زیبِ زنداں ہو کے مل بیٹھے

یہ وہ مجمع نہیں ناصح جہاں ہو دھنسل وانا کو

مگر تجھ سا کوئی مکار، ناداں ہو کے مل بیٹھے

یہ انساں زاپری و ش ایسے دل کش ہیں کہ بے حشوت

پری آوے اگر ان میں، تو انساں ہو کے مل بیٹھے

یہ اطفالِ حسیں عاشقِ کاجی لینے میں شیطان ہیں

جیسے عاشق وہی ان میں جو شیطان ہو کے مل بیٹھے

بقا ہم گبرِ نامسلم تھے پر آکر بہ ناپاری

وہ مسلم زادہ طفلوں میں مسلمان ہو کے مل بیٹھے

تھے ہم استادہ ترے در پہ، ولے بیٹھ گئے

بزم میں شیخِ جی اب ہے کہ ہے یاں عیب ہیں (کذا)

فرش پر گر نہ ملی جا، تو تلے بیٹھ گئے

غیر بد وضع ہیں، محفل سے شبابِ اُن کی اٹھو

پاس ایسوں کے تم اے جان بھلے بیٹھ گئے

گھر سے نکلا نہ تو، اور منظروں نے تیرے

در پہ نالے کیے یاں تک کہ گلے بیٹھ گئے

ناتواں ہم ہوئے یاں تک کہ تری محفل تک

گھر سے آتے ہوئے سو بار، چلے، بیٹھ گئے

اشک اور آہ کی شدت نہ تھمی، گرچہ بقا

گھر کے گھر اس میں ہزاروں کے جلے، بیٹھ گئے



ترے جو خالِ سیہ لب پہ آشکارا ہے      کسی کے بختِ سیہ کا مگر ستارا ہے  
 چمن میں لالہ نہیں، تجھ کو دیکھ کر قاتل      زمیں سے خونِ شہیداں نے جوش مارا ہے  
 وہ زلفِ بارِ دلِ مضطرب اٹھانہ سکے      یہ قطرہ خوں جسے دل کہتے ہیں گے پارا ہے  
 ہواے عیش نہیں، جب سے ہجر میں تیرے      الم کو قول دیا، غم سے ہاتھ مارا ہے  
 نہیں دیا ہے جوابِ اضطراب نے اس کو      کبھی جو صبرِ درِ دل پہ آپکارا ہے  
 بقا کی آہ نے اُس میں کبھی نہ کی تاثیر  
 بتاں! یہ دل ہے تمہارا کہ سنگِ خارا ہے

اگر مشفق و مہرباں ہے تو تو ہے      بلاے دل، آشوبِ جاں ہے تو تو ہے  
 فلک پر چڑھا مجھ کو اے نشہ مے      کہ اس بام کی نردِ باں ہے تو تو ہے  
 جداست ہواے داغ چھاتی سے میری      گئے دل کا اب اک نشاں ہے تو تو ہے

یاد میں تڑپے ہے یہ کس لبروے خمدار کی      آج کچھ ناخن بہ دل ہے آہ اس بیمار کی

رُخ اُس کا صفا تیرے کفِ پاکی نہ پاؤ      خورشید ہزار اپنے تئیں چرخ چڑھا دے

تیرا حسرتِ مری جانبِ کمانِ یار سے      دیکھتا تیچھے کو آیا دیدہ سو فار سے

۱۷ ج۔ ۱۷ م، ع: تڑپے ہے دل۔

۱۸ ز، ش، شع: اُس۔

۱۹ ہ: رخ اُس کا صفا تیرے تلووں کی۔ د، ل، ش، ک، ن: صفا تیرے تلوے کی۔



گریے سے بعد مرگ یہ طغیانِ آب ہے      گبند مرے مزار کا مثلِ جاب ہے

خوں جگر میں نہ رہا، گریے کے کرتے کرتے      ہو گیا شیشہ تہی جام کے بھرتے بھرتے

آگرہ زیرِ مشرگاں یوں دل کا تخت دم لے      جوں آن کر مسافر زیرِ درخت دم لے

سخن کی آب افزوں ہو جو اہل ہوش تک پہنچے      گہر ہوئے وہ قطرہ جو صدف کے گوش تک پہنچے

ہم آکر مر گئے ظالم تری دہلیز پر ڈر کے      موئے افسوس کس جاگہ ہوئے گھر کے نہ باہر کے

نہ گھر ملے، نہ تو باہر نہ آستان پہ ملے      تو ہی بتا کہ ملے تو، تو کس مکاں پہ ملے

ملی تھی دل میں اس ناوک کی بھال... سے      خدا جانے ہوئی کا ہے سے بیدل.... سے

ماہِ نوا نجم کے عقدے کس طرح سے وا کرے      ہوں جہاں لاکھوں گرہ واں ایک ناخن کیا کرے

کیا تجھ کو لکھوں خط، حرکت ہاتھ سے گم ہے      خامہ بھی مرے ہاتھ میں انگشتِ ششم ہے



دیدہ تر چھٹ چواوے کون اس کے منہ میں آب  
نزع کے دم گر ترا بیمار منہ کھولے رہے

گر دو گے بقا کو تم آنزع کے دم بوسہ تو اس کے تئیں گویا تم آب بقا دو گے

(نوٹ) مخطوطے میں ورق ۱ الف پر سب سے پہلے ایک رباعی ہے جس پر یہ عنوان لکھا ہوا ہے "رباعی ہجو میر تقی" لیکن یہ حقیقت ۵ اشعار پر مشتمل قطعہ ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے :

عیب ہے گرچہ کثرت یک لفظ سخن فارسی سے تاہندی  
یہ قطعہ حصہ ہجویات میں شامل ہے۔ اس قطعے کے نیچے ۴ متفرق شعر لکھے ہوئے ہیں۔ پہلے شعر پر بطور عنوان "ولہ" لکھا ہوا ہے، یہی صورت دوسرے شعر کی ہے۔ البتہ اس کے بعد "ولہ میر تقی" لکھ کر دو شعر لکھے گئے ہیں۔ یہ چاروں شعر اسی طرح درج کیے جاتے ہیں۔ بقا سے ان اشعار کا انتساب محل نظر ہے۔ اس لیے ان کو اصل متن میں شامل نہیں کیا گیا۔ یہ اشعار جس صورت سے لکھے ہوئے ہیں، اسی طرح نقل کیے جاتے ہیں۔ تصحیح سے کام نہیں لیا گیا۔

ولہ

یہ تو نہیں کہتا ہوں کہ سچ مح کر و انصاف بھوٹی بھی تسلی ہو تو ضائع نہ ہوں میں

ولہ

بیکل جو بھی جاتی تو سب یہ خلل جاتا نکلا ہی نہ جی ورنہ کا نٹا سا نکل جاتا



ولہ میر تقی

فرادہ تیشہ پہ پیچھے ہی ڈالتا      پتھر میں سر ہاتھ ہی اپنا نکالتا  
تھا مستعار حُسن سے اس کے جو نور تھا      خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرا طور تھا

---



رباعیات

و

قطعات







زاری کی نہ میری کچھ اُسے شرم ہوئی      رونے سے نہ طبع اس کی کچھ نرم ہوا  
ہر آہِ خنک بفتا خنک تھی اس پر      اب نالہ گرم سے بہت گرم ہوا

### رباعی تجنیس

یا کاش کہیں لگیں ٹھکانے مرہم      یا کاش کہیں لگیں ٹھکانے مرہم  
مرہم لگیں زخمِ دل پہ تا ہوئے زیت      یا کاش کہیں لگیں ٹھکانے مرہم

آتا ہے یہ دل میں عشقِ بازی کیجے      اس دل کو کسی بت کا نازی کیجے  
چشمِ اُس کی بقا رام نہ ہوئے، تو بھی      اپنی سی غرض زمانہ سازی کیجے

اس باغِ جہاں کے پیچ ہنگام بہار      جتنے تھے درخت، میوہ لائے برو بار  
امیدِ ثمر میں ایک اپنا ہی بفتا      ہے دستِ تہی بلند مانند چنار

### درند متِ نفس

گو ہم پے دیں کفرِ تجیں بے کم و کاست      چھوڑیں طلبِ حق میں بتاں کی در خواست  
سوسال بقا زیرِ زمین رکھیں دفن      تو بھی نہ سگِ نفس کی دم ہوئے راس

آوارہ وادیِ طلب کو افلاک      ہر گاہ کریں جوہر و تعدی سے ہلاک  
بیوندِ زمین بھی کر کے آرام نہ دیں      پھر شیشہٴ ساعت میں بھریں اُس کی خاک



صیادِ ستم پیشہ و آزار دہا      کب ہم نے کہا بند سے کہ ہم کو رہا  
مرنا تو مسلم ہے، پر اس عرصے میں      ہو جائے جو سیرِ گل میسر، فہا

عاشق ہوئے جب ترے، تبھی سے نہ بنی      اک ہم سے فقط نہیں، سبھی سے نہ بنی  
امیدِ کرم پہ کیا ترا کھینچیں جوہر      کب آگے بنی، اگر ابھی سے نہ بنی

چھتے ہیں جو غم کے خار پہلو پہلو      تڑپھے ہے یہ بے قرار پہلو پہلو  
اتنا بھی دبا نہ چل بقا کو اے عشق      اے اشتر بے ہارا، پہلو پہلو

۵

نوع	ک دولت و جاہ ابدی مکا	د
ی چرخ ہیں جوں اہل - اس کے	م	تا غیر کو شہرت ہے اب اس کا
نی	۱۲۱ چنہ ابوم وہ ہے ظلم اور	ج

۱۵ مالکِ دولت و جاہِ ابدی ٹیکا رام      ماتا غیر کو شہرت (سے) ہے اب اس کا نام  
مائعِ ظلم سے وہ بدل فرما صبح اور شام      ماشیِ حرخ ہیں جوں اہل (ہاں) اس کے غلام



مغظم	امیر	بدولت	تقی خاں
مکرّم	خلائق	میان	بدولت
بدلہا	معزز	خلائق	امیر
مسلم	بدلہا	مکرّم	مغظم

۱۵  
 مند ہے وہ ترایا رہے وفا  
 اقبال  
 ق  
 ۱  
 عام میں جو وفا ہے  
 ۱۶  
 اس رشک میں کہ نہیں ملتا تو ہے بقا  
 ۱۷

افواہ عام میں جو وفا ہے آشنا  
 اس رشک میں کہ نہیں ملتا تو ہے بقا

۱۵ اقبال مند ہے وہ ترایا رہے وفا  
 .... تو اب ہوا ہے ترا اس تلک رہا



۱۵  
 بزم میں کب ہے تقی خاں کا کوئی اب  
 رزم خود اس کی ہے داد و دہش در  
 بزم احوال بہ نوحہ و گنجائش  
 رزم کرے بیم سے فوج ان کے بہ احوالِ بتر

---

۱۵ بزم میں کب ہے تقی خاں کا کوئی اب ہمسر  
 رزم کرے بیم سے فوج ان کے بہ احوالِ بتر



قصائد







جب مری چشم گئی نیند سے کل رات جھپک  
 خواب میں آئی نظر مجھ کو وہ غیرت وہ حور  
 عضو عضو اس کا ہر اک خوبی و رعنائی میں  
 مانگ وہ جادہ ظلمت کہ سکندر جس میں  
 نیچی کنگھی میں درخشاں تھی یہ کچھ وہ کافر (؟)  
 من تو کالے کا وہیں دم میں دیا سا بجھ جائے  
 عام تھا دورِ قد و زلف میں اس کے ورنہ  
 جا چھپا زیرِ زمین عہد میں اُس کا کل کے  
 خطِ رِیحاں سے بنا جیوں کوئی جو تو را  
 لاف جب حسن سے مارے، تو کہے یوں وہ حسیں  
 اُس جبینِ عرق افشاں سے تھی ابرو کی یہ دھج  
 کھل گئے پھر تو یکا یک مری چھاتی کے کواڑ  
 بے گنہ قتل پہ مردم کے کرے تھی سرگرم  
 کیا کروں چشم کی تعریف کہ وہ دونوں ترک  
 اُس کے ابرو سے تو تھی ہاتھ میں اس کے شمشیر  
 تیغ پہلے جھکی جس کی طرفِ ثانی پر  
 مصحف اس روئے کتابی سے کرے گہ دعوا  
 حسن نے اس لیے بینی سے اٹھایا بیڑا  
 تھا شکنجے میں تپاں حسن کے دل عاشق کا

طالعِ خفہ مے جاگ اٹھے لگتے ہی پل  
 حور بھی دیکھ کے شاید جسے رہ جائے بچو  
 ایک سے ایک زیادہ تھا جو کی غور تنک  
 جا کے یک چند رہا کور کی صورت سے بھٹکا  
 جیسے تحریر کوئی زر کی ہو بالائے محاک  
 دیکھے عارض پہ جو اس طرہ مشکیں کی لڑکا  
 شاخِ شمشاد پہ کوئل نہیں پھوٹی اب تک  
 چھوڑ کالے کا برن خوف سے راجا بار  
 ڈھیلے پیچوں نے دیا یاں وہی گردن کو مر  
 ہوں تو میں ماہِ زمیں، لیک یہ از ماہِ فلک  
 منہ برستے میں ہو جس طرح نمودار دھند  
 لگی دینے جو وہ مرثگاں درِ دل پر دستک  
 چشم، اُس غمزہ خوں خوار کو دے کر پرچاک  
 بھڑ گئے تو سن شوخی کی بہم باگ اچک  
 اس کے ابرو سے رہی ہاتھ میں اُس کے برچھک  
 کھا کے مرثگاں کی تھپیڑا ٹھکی الٹی ہی جھٹکا  
 دیکھ کر صورتِ بینی کو رہے جی میں بچھک  
 کہ میں آفاق سے دل لے کے نہ چھوڑوں حتی تک  
 دونوں عارض میں جو دیکھے کوئی نتھنوں کی پھر کر



منخرین اُس کے وہ دو چشم کہ افراطِ حیا  
 بسکہ رکھتے تھے وہ باہم نظرِ شیشہ گداز  
 دونوں لب اُس کے تھے خجالت وہ یا قوتِ عقیق  
 مہی لب سے دہن پر یہ تبسم کی بہار  
 سترگوں چاہِ زرخداں کو جو اُس کے دیکھا  
 پڑ کے مراّت زرخداں میں کسی چاہ کا عکس  
 گوش یوں زلف میں لگتے تھے، صدّ کو جس طرح  
 یوں چمکتا تھا پڑا اُس کے بنا گوش کا دُر  
 بنجہ مہر نہ ہو سرخ شفق سے سرِ شام  
 رنگِ پاں یوں تھا نمودار گلے سے اُس کے  
 کیا کروں اس کی میں اب ناز کی دل کا بیاں  
 جس طرح زخمِ مطرب سے ہلے بین کا تار  
 جسم کو سِلْمَن الملک پہ مارا ہے دوال  
 جب نظر اُس کے دوپستاں سے کمر تک پہنچی (ق)  
 ٹوپیاں آنکھ پہ دے دی ہیں، وگرنہ یہ کمر  
 سینہ و پشت و پہلو میں یہ تھی شفتا فی  
 کینِ دل پر مگر اس حن جہاں سوز سے تھا  
 ناف ایسی تھی کہ جوں چھپ کے کوئی غیرتِ حور  
 آگے کچھ بات ہے پردے کی جو چاہوں تو کہوں  
 ران اور ساق نے اُس کا سہ زانو کے طفیل  
 کعبتیں اُس کے دو کعبین قدم مہرِ بساط

پشتِ پاسے نہ اٹھانے دے کبھی اُن کی پلاک  
 ساتھ شیشوں کے نہ دیکھی میں انھوں کی عینک  
 سلاک گوہر تھے وہ دندان و دہن جیوں جاک  
 جس طرح غنچہ سوسن کھلے اندک اندک  
 (ق) بعدِ صد غور یہ سمجھا میں کہ بے شبہہ و شک  
 محو حیرت ہو، گیارہ نکلنے کی بھٹک  
 لبِ دریا سے لگا دیتی ہو لہروں کی جھٹک  
 اخترِ صبح جسے دیکھ کے رہ جائے بھپک  
 سرخی در یوزہ نہ دے وہ کفِ نگیں جب تک  
 مے کی معلوم ہو جوں گردِ دین مینا سے ڈلک  
 پات کھڑکے تھا تو وہ خوف سے جاتی تھی جھپک

مت سمجھ اس کے دوپستاں میں تو چھاتی —  
 اُس کی انگلیاں کو یہ سمجھا میں کہ بے شبہہ و شک  
 کرتی صیدِ دلِ عشاق پہ چیتے کی لپک  
 جاوے آنکھوں میں، جنھیں دیکھ کے بجلی سی چمک  
 چار آئینہ سجے کام کا سالارِ بیزک (ب)  
 کھول پردے کو ذرا سا ہے ایک آنکھ سے تک  
 پر حیا مجھ سے یہ کہتی ہے کہ یہ ہودہ نہ بک  
 ایک کا سے مین ہم حُسن کی چکھی تھی چشک  
 جیت لیں جو دلِ عاشق کو بتا کر چہلک



فندقِ پامیں یہ سُرخ تھی کہ زیرِ شمشاد  
 نیزِ شمشاد کے ریشوں میں تو قمری نے کبھی  
 دھج یہ دیکھ اُس کی جودل ہونے لگا مجھ سے دواع  
 پرکششِ نام جو کی میں نے تو وہ مایہ ناز  
 نامِ دولت ہے مرا، میں ہوں عزیز ہر دل  
 ہوں دلا رام میں نوابِ محبتِ خاں کی  
 یہ کہا مجھ سے مخاطب ہو کہ اے صاحبِ ہوش  
 کر ذرا اس کی تائیش میں تو اظہارِ کمال  
 مدح گستر ہو وہیں شوق سے سن میں نے یہ بات  
 دفعۃً ہو کے مخاطب بہ خیالِ ممدوح  
 تو وہ نوابِ فلک جاہ ہے، در پر جس کے  
 تیرے کف کو کہوں کف، یا صدفِ گوہرِ بخش  
 تو وہ حاتم ہے زمانے کا کہ ہنگامِ سحرا  
 محلِ کوہ و دریا، زروسیم معدن  
 یعنی اب مجھ کو دفائن سے خبر دو تحقیق  
 ایک درہم کا کرے تجھ سے جو شخص آ کے سوال (ق)  
 کہے تجھ سے وہ بس انجے میں مانگوں تو قسم  
 نسبتِ مابین اتنا ہے تم سے دور میں عدل  
 تاب کیا ہے جو قدم گاڑ کے یک جا ٹھہرے  
 نہیں امکان جو بکری کے تئیں کھانے شیر  
 شرع رائج ہے تم سے دور میں یاں تاک کہ دام

جس طرح بیز بہتی ہے آتش سی دہکا  
 اشکِ گلزنک سے دانے نہ پڑے یاں تاک  
 وقتِ رخصت میں کہا اُس کو کہ اللہ مٹا  
 متکلم ہوئی یوں، مار کے مجھ پر چشمِ تاک  
 طربِ عیش ہے یاں اہلِ دول کو مجھ تاک  
 بہرہ ورجس کی سخا سے ہے کہ وہ ہر یک  
 شاعری مجھ کو ہے ہر نکتے سے تیرے مدرک  
 جب ملک ہو سکے ظاہر، تو نہ رکھ سینے میں دھاک  
 پڑ کیا گوہرِ معنی سے سخن کا درجہ  
 شریہ دل کے سفینے سے میں لایا لب تاک  
 جہہ سا عجز سے ہے روزِ بختیں سے فلک  
 دل کو بھی دل کہوں، یا ثانی دریائے اک  
 لہر دل میں تم سے آئے جو سخاوت کی تنک (ق)  
 بخش اک پل میں کرے اہلِ خبر پر دستک  
 تو میں کھدوا کے کروں قفِ بزرگ کو چاک  
 شہرِ رنگ آئے زروسیم سے اُس پر یاں تاک (ق)  
 تو یہ فرمائے کہ کچھ اور لے، یہ ہودہ نہ باک  
 کہ ہے اہلِ ستم، دیکھ ستم کش کو، دیا  
 آپڑے کان میں ہاتھی کے جو پتے کی بھنک  
 شیرِ بکری جو تم سے عہد میں کھیلےں کو دک  
 دھولِ طلبوں کے لگے، کھائے پھیرے ڈھولک



بُردباری تری لنگر دے، تو یہ مرکزِ خاک  
 کہ بنے نیل کا زنداں دین اُس کی ہر شاخ  
 اور جو کوہاں ہے، سو... وہ بنے اشتر کی  
 مہ کی غربال میں، لائق ہے کہ چھانیں گل کو  
 عوضِ خشتِ ستاروں سے جڑیں سنگِ بلور  
 رفعتِ اتنی اُسے دیویں کہ نظر گردوں کی (ق)  
 تارک اُس کے سے گئے خاک پہ عمامہ مہر  
 صحن میں اُس کے ہو آراستہ وہ چار چین  
 شیشہ ہر غنچے کا پڑ ہوئے گل رنگ سے واں  
 برگ، صرصر کے جھکوروں سے بھی دیتے ہوں مال  
 بلبلیں نغمے سے رکھتی ہوں سبھی شغلِ سرور  
 صبحِ نوروز، ہر اک صبح کو واں کہ صبا  
 تیرے دامن پہ اگر اُڑ کے پڑے ذرہ خاک  
 فارسی شعر جو کہتا ہے تو، اُس کے آگے  
 ریختے ہیں جو تری طبع ہو تاکِ نغمہ سرا  
 سیفی ہے سیف تری جانِ عدو کی خاطر  
 جڑھ گیا چرخِ بلندی پہ اُسی کے ڈر سے  
 تو کہیں وقتِ غضب ہاتھ میں تیرے آکر  
 تیرے خیمے کی تو کیا ہو سکے مجھ سے تعریف  
 بادریسہ نہ کریں شمس و قمر کو اُس میں  
 وصف میں اب تم سے تو سن کے پڑھوں اک مطلع

یک بہ یک گاؤں میں پر گمے اس طرح داک  
 توڑ کر سر کو نکل آئے دہن سے ہر یک  
 بیٹھ کر پشت میں، آئے تلے چھاتی کے لٹک  
 ڈالیں جس جاتے رہنے کو بنائے کو شک  
 طشتِ خورشید میں بادل سے لگاویں آہک  
 پائے دیوار سے پہنچے جو لبِ بامِ ملک (ق)  
 خطِ محور سے اگر باندھ نہ لے تحتِ خنک  
 کہ جسے غیرتِ فردوس کہیں زیرِ فلک  
 ساغرِ لالہ سے گرتی ہوئے لعلِ جھلک  
 مرغ، مردنگ بجاتے ہوں ہر اک سمت پھرک  
 گلبنیں، موجِ صبا سے رہیں لولی سی تھرک  
 بیضے غنچوں کے لڑاتی رہے سراور.....  
 چرخ دے پنچہ خورشید سے دامن کو جھٹک  
 ہے سخن اہل سخن کو سخنِ سعری تاک  
 شعرِ سودا کے ملے کھنڈ سے دھوبی کے فلک  
 موٹھ جادو کی ہے موٹھ اُس کی بلا شبہ شک  
 ہو گئی فرشِ زمیں، بن میں رہے کوہِ دباک  
 کاٹ کاڑھے نہ یہ خوں ریز سماتا بہ سمک (د)  
 جس جگہ تیرے طویلے کی کھڑی ہو اسپاک  
 کہ بڑی چرخ سے ہے وہ، یہ نہایت کوچک  
 سن کے صرصر جسے، نخلتِ زدہ ہو جائے سرک



لیوے سبزے کی ذرا اپنے جو تو باگ چک

جا کے بازی وہ ہوا میں کرے مثل سبزک

یوں چھپے اُس سے تو، جوں چاند کے چائل ہو چکے  
حصر پر لشکرِ اعدا کے کبھی ہو کے سوار  
سرعت اتنی وہ کرے حلقہ زنی میں کہ غبار  
سمجھے اُس اسپ کو القصد یہی دیر کے بعد  
اڑ رہا ہے یہ کوئی، مار کے حلقہ جس نے  
ٹمک نظر اور اٹھائے تو کہے یوں جی میں  
گرداب فوج کے کرتا ہے بنیٹھی خورشید  
پھر کرے تیغ زنی تو، تو وہیں اک دم میں  
ایک حربے سے گریں گرد میں سو کا سہ عسمر  
آوے دشمن کا تھے کیوں نہ تباہی میں جہاز  
شوکت و شان جو ہاتھی کی تھے، کی میں خیال

اُس کے ماتھے پہ غرض، کیا کہوں میں شانِ کجک

جس طرح ابرِ سیہ میں ہو نمودار دھنک

دانت اُس کے کوئی دیکھے جو دوسرے خرطوم  
جوشن و خود و زہرہ، مونے سیہ تاب پہن  
وقت کشتی کے، سکندر نے کسی زنگی کو  
یا خفا کج سے ہو، شب کو کنھیا نکلا  
ہے وہ برحق اسی قابل، نہیں کچھ اس میں دروغ  
صورۃً تو جبرِ اسود ہے وہ، اور دانت اس کے  
قدم اگلے مع گردن، وہ یہ سمجھے بے شکر  
داستانوں کی دکھا ساعد و گردن پہ چکر  
بھر کے کوئی میں، لیا مرکزِ خاکی سے اچک  
رادھکانے لی ہے پیچھے سے کمر اس کی لپک  
کہ وہاں اس کے کو دے بوسہ جو مومن ہر یک  
دونوں بازو کے .... ہیں بلا شبہ و شکر



حلقہ کر کے، وہ خرطوم کو لے دانتوں میں  
 زہرہ با ساعدیں، کیے دو ہاتھ دراز  
 پھر یکایک جو وہیں چشمِ تفکر میری  
 دانت یوں لٹے، کہ بہتی نہ سنی ہو ویں گی  
 آکے جب باؤ میں، متک وہ کمرے اپنی بلند  
 قلزمِ نیل میں یوسف نے لگا کر غوطہ  
 ہو سوار اُس پہ تو اس اوج کو پہنچے کہ مسیح  
 جب بٹھا کر تو اُسے، قصد اترنے کا کرے  
 چار میں چرخ سے آ بامِ حرم پر عیسیٰ  
 بخت و پز کا تے مطبخ کی کروں کیا میں بیاں  
 ماہِ داں چاہے کہ میں قابِ پیدے کی بنوں  
 لاکھ من مائدہ داں ہو جائے  
 دیگِ شنوئی کو نہ پورا ہو کنوؤں کا پانی  
 نانِ نعمت کا نہ پھر نام لیں جو ہیں خوشخوار  
 تیرے مداح کو بھی اب یہ توقع ہے کہ روز  
 میں تو سوتا تھا، یہ یہ خواب تصور ہے مجھے  
 بس بقا، کر تو دعائیہ پر اب ختمِ کلام  
 نت خوشی بزم میں تیری ہے، اور در اوپر

اُس کے عاجین کو سمجھیں یہ بزرگ کو چک  
 غرہ چرخ میں آئی ہے بجانے ڈھولک  
 پہنچی تا غارِ دہن، چھوڑ کے اُس کی متک  
 بیستوں سے کہیں دوشیر کی جوئیں اب تک  
 اُس کے دانتوں پہ یوں جائے گمانِ زیرک  
 ہاتھ پانی سے نکالے ہیں مگر کہنی متک  
 لاترے ہاتھ دے آئینہ خورشیدِ فلک  
 عرش اور فرش میں یوں شور کریں و ملک  
 زردباں مانگے ہے تا آوے اتر صحنِ ملک  
 جس میں موقوف نہ دن ات ہو دیگوں کھڑک  
 ہر کے جی میں کہ زر دے کی میں اں ہوں صحنک  
 لون سانجھ کا ..... کھانے میں نہک  
 کاٹ کر نہر جو داں لائیں نہ دریائے اہک  
 تیرے مطبخ سے ملے اُن کو اگر اک جلیک  
 زلہ خوان سے پایا کمرے اک قابِ خشک  
 جس کی میں پریش تعبیر کو آیا یاں تنک  
 آمیں، سن سن کے کہیں جس کے تئیں انس و ملک  
 ہو طرب حلقہ زن، اور عیش دے آکر دستک

تیرے ہر دوست کے، دولت ہے قدموں سے لگی  
 سرِ اعدا ہے سرِ چنگِ حوادث سے کلک



معنی سے کہ اب جامِ سخن کو سرشار  
 یعنی اب مدحتِ نوابِ تقی خاں کیجے  
 چشمِ گردوں کے لیے، جس کی زمینِ در سے  
 اس کے ہاتھوں سے جو سائل کوئی ہنگامِ سخا  
 متحمل — اس کی سمائی کا نہ ہو  
 تیغ میں اُس کی یہ برش ہے کہ ہنگامِ غضب  
 اس طرح صاف نکل جائے اُسے کر کے دو نیم  
 عدل میں بے بدل ایسا ہے کہ ہر کیس سے  
 عدل کا اُس کے جو صمود ہے کوئی دستِ آموز  
 اُس کا شبِ ریز تو خشکی پہ جہاں پیسا ہے ق  
 یوں قدم تیز اٹھائے کہ ذرا پانی میں  
 فیل اُس کا یہ تناور ہے کہ بالائے زمیں  
 دن کو دیکھ اُس کی سیاہی، مجھے آتا ہے عجب  
 دور میں اُس کے یہ ہے رعبِ شریعت غالب  
 مثلِ قصا د، غرض ہاتھ سے ہر طرب کے  
 اس کے خیمے کی بزرگی کا کروں کیا میں بیاں  
 فرشِ محمل پہ ہے استادہ بہ اس شوکت و شان  
 اُس کی اب خاصہ خوری کا ہے — خانہ  
 نانخورش کے ہے پیالوں پہ مہرِ نو قرباں

دل میں ہے، تو ٹیپے صہبائے خموشی کا خم  
 بامضامینِ تروتازہ، بہ ضمنِ اشعر  
 گردِ باد آ کے اٹھاتی ہے سراجھک کے غم  
 سیم وزرے کے، کمرے صحنِ جہاں میں اند  
 جوں خیمِ خام بکس جائے سپہرِ دو  
 کمرِ چرخ پہ بیٹھے جو کرے اُس کا  
 برق کر جائے ہے جس طرح کہ گنبد سے گر  
 خود ہیں آزار کش اب وہ، جو تھے مسکیں آ  
 اڑ کے، جنگل میں وہ شہباز کو کرتا ہے ش  
 سطحِ دریا پہ بھی دوڑے جو وہ صرصر  
 سُم، سوا نعل کے، تر ہونے نہ پاوے ز  
 اٹھے ہے دارِ صفت، بیٹھے ہے مثلِ کہ  
 رہ گئی ہو کے گرہ کیونکے زمیں پر شب  
 نہیں ممکن کہ کمرے نغمہ کشی ساز کا  
 رنج میں نشترِ ناخن سے ہی رہتا ہے  
 طول اور عرض میں تو سارے جہاں کا ہے  
 جس طرح باغ پہ ..... ابر  
 جس کے ہر خوان سے بدلا ہے فلک نے در  
 خوانچوں پر ہیں منش کے مہر و خورشید



چست کرے زیں پہ جو دشمن کو لگا تیر بہ حلق  
خون ..... جس طرح کسی طائر کا  
نذرِ مدوح کی خاطر بضرورت میں نے  
کر بقا شعرِ دعائیتہ پر اب ختمِ کلام  
جب ملک نام سخن کا ہے جہاں میں باقی  
یوں ہے رو بہ فلک اُس کی نمایاں سو فار  
باز کرتا ہے کوئی باز اٹھا کر منقار  
کہ لیے بیٹھ کے اک دم میں یہ کتنے اشعار  
تا کرے جا کے وہ ایوانِ اجابت میں گزار  
اور شہرت ہے سخن گو کی بہر شہر و دیار

وہ رہے ساتھ احباب کے سدا م و شاد  
دل اعدا کو رکھے خنجر اند وہ نگار

کل حضرت بقا سے کیا میں نے یہ سوال  
بولے جواب میں کہ یہ منظور ہے، تو کر  
جز خادمانِ فکرِ سخن، اپنے پاس تک  
لیکن وہ ہو جگہ، جو درِ دل کو کھویے  
ہو شاخِ گل پہ نغمہ سرا عند لبِ عیش  
گل واں کے، دل کو صید کریں عند لبِ وار  
زلفِ بنفشہ کھول کے شانہ کرے نسیم  
یوں غنچے سبز جیب ہوں، بیٹھیں ہیں جس طرح  
ہوں ادھ کھلی کلی سے گل ایسے نمود، جوں  
تینغ شعاع کھینچے جو سایے پر آفتاب  
بہتی ہو اس قدر روشن باغ کے قریب  
کہیے کچھ ایسے شعر کہ ہو ویں وہ حسبِ حال  
آراستہ ہمارے لیے خلوتِ خیال  
ساقی کو بھی نہ ہوئے گزرنے کی واں مجال  
آجائے واں بتوں کا نظر گلشنِ جمال  
پر مائے واں نہ زارِ غم و کسِ ملال  
گر ایک سو بنفشہ و سنبل سے دھر کے جال  
گو ہر پرہیزے قطرہ شبِ نیم سے بال بال  
گردن مراقبے میں جھکا صاحبِ کمال  
یوسف رہا ہوں روزِ ننداں سے سزِ نکال  
سو رچ مکھی ہو سامنے اُس کے پکڑ کے ڈھال  
تا گل کی آبرو ہو آئینہ جمال



مرغانِ بوستان سے جو رخصت بھی ہو بہار  
ایسا اگر مقام ہو تو کیا مضایعت  
کی میں نے عرض قبلہ، یہ مشہور ہے مثل  
حاضر ہے مختصر سامرے دل کا یہ مقام  
بوئے یہ مسکرا کے، کہ سب کلیں ہیں سہل

چھوڑے چین میں وہ گل و نسرب کو بغیر  
پل میں سخن کے گنج سے کردوں تجھے نہال  
راجہ کے گھر میں بھی ہے کہیں مودیوں کا  
یہ ہے زیادہ اُس سے جو کی تم نے قیل و قال  
لیکن شکستِ خاطر احباب ہے محال

ممدوح سن ذرا کہ کوئی دم کی منکر میں  
آئینہ توجو ہاتھ میں لے لے نکو خصال  
مل کر ہوئی ہے تجھ مہر کنعاں سے پھر جواں  
گو تیرے ساتھ گنجفہ مکر روز و شب  
ہر چند اُس کئے ورقِ آفتاب ہے  
عادل تو اس قدر ہے کہ اب تیرے عصر میں  
ہے مدر سے میں جو کوئی معقول داں، سواب  
پانی پییں ہیں ایک جگہ اب تو گرگ و میش  
شرعِ نبی ہے یہ کچھ اب دور میں ترے  
طنبور جب یہ چاہے کہ نغمہ کروں بلند  
مطلع پڑھوں اب ایک ستائش میں تیغ کی

اُس دم نہ تیری مدح ہوئی اُن سب حال  
ہرگز پڑے نہ عکس، تو اتنا ہے بے مثال  
دنیا اگرچہ مثلِ زلیخا تھی پیرِ زوال  
کھیلا کرے یہ چرخِ مشعب ہزار سال  
پاتا ہے گا پر ترے ہاتھوں سے نت خلا  
یکسر مزاجِ دہرنے پایا ہے اعتدال  
کرتے ہیں اُس سے جا کے سبھی لوگ سوال  
پس کیونکے اجتماعِ نقیضین ہے محال  
نیتِ خلافِ شرع کہے کوئی، کیا مجال  
فی الفور کھائے ہاتھ سے مطرب کے گوشمال  
دشمن کے جی کو جس کی فصاحت بنے وبال

چمکے اگر وغا میں تری تیغ جوں ہلال

پُر زے کرے کتاں کی طرح جسمِ بدسگال

مالے ذرا میان سے اُس کے تیئیں نکال  
کاسہ اُتارے چاک سے جوں رشتہ کلال

اگر غضب میں تو، کمر چرخِ بر کبھی  
سو ہے یقین مجھ کو کہ یوں اُس کو دو کرے



.....  
 قوت یہ سمجھ میں ہے کہ کوئی گرو تنگ دو (۹)  
 لنگر تو دیوے اُس گھڑی ایسا کہ دفعۃً  
 مارے زمین پر یوں کہ ہوں سب چور استخواں  
 بخشے سے بس کہ لعل و گہر بے حساب تو  
 دریوزگی کو کوہ نے دامن کیا دراز  
 لگتے نہیں زمین پر قدم تیرے پیل کے  
 جس طرح غول باندھ زمین سے ٹکاک بلند  
 بیٹھے، تو کوہ شکل ہے۔ پر اٹھ کے جس گھڑی  
 خرطوم حلقہ کر کے جردانتوں کے درمیاں  
 گود برچھپ گیا ہے سراپا خسوف میں  
 مطلع لکھوں اب اک تیرے مطبخ کے وصف میں  
 لے دوڑیں آب کش جو ہاں مشک او پکھال  
 ایسی جگہ میں چاہیے گردوں بنے تنور  
 رفعت میں تیرے خیمے کی اب کیا کروں بیاں  
 سرعت میں کیا بیان کروں تیرے اسپ کی  
 ہو کر سوار جب کہ تو اُس رہ نور و پر  
 پھینک اُس کو حدِ غرب سے میدانِ شرق تک  
 نقشِ سم اپنے واں سے یہاں تک اک آن میں  
 پھر اُس کو، عزمِ سیرِ زمانی جو کر کے تو  
 تو ہے یقین مجھ کو کہ طے کرے آن میں

سمجھے ہے یوں کہ موت مارا ہے اُس پہ جال  
 کشتی میں گر یہ چاہے کہ لے جاؤں تجھ کو مال  
 گر جائیں پانویں تیرے زمیں بیچ جوں جہاں  
 اچلے پھر اُس کو تو جو پکڑ کر کمر دواں  
 لے حاتمِ زمانہ، تر اسن کے یہ نواں  
 باہر صدف نے ہاتھ دیے بحر سے نکال  
 اس طرح سے وہ پانواٹھاتا ہے.... چال  
 کھولیں بہم کبوترِ دشتی ہوا میں بال  
 بازی کناں خوشی میں کبھی وہ فلک مثال  
 بیوے، تو اُن پہ ہوئے یہ ناظر کو احتمال  
 ہر دو طرف گھلا ہے بہ مقدارِ دو ہلال  
 جو واں کی سخت و پز کی زیادت پہ ہو دواں  
 خالی ہر ایک چشمہ، تہی ہو ہر ایک تال  
 خورشید ہو رفیدہ، لگانے کو شیر مال  
 پستی سے جس کے سامنے گردوں ہے ایک مال  
 آفت ہے اُس کی دوڑ، قیامت ہے اُس کی چال  
 دل نیچ لائے سیرِ مکانی کا گر خیال  
 موٹے پھر اس طرف انھیں قدموں تو وہ غزال  
 کر دیئے رشکِ بدر، جو ہوں غیرتِ ہلال  
 حدِ ازل سے سوے ابد اُس کو دیوے ڈال  
 اس عرصہٴ بعید کو وہ صاعقتِ مثال



پلٹے جو پھر ابد سے، تو پہنچے ازل تلک  
ایسا بیانِ مدح و ثنا میں سخن نے طول  
اشناے راہ میں سنہِ ہجری سے کہ وصال  
لازم ہے اب دعا پہ کروں ختم یہ مقال  
نہت دوستوں کو تیرے رکھے چرخِ شاد کام  
اور دشمنوں کو تیرے کرے جلدِ پامال

---







مجموعات







## مثنوی در ہجو مسیہ

ان آنکھوں کا نت گریہ دستور تھا  
جو سیلاب اشک ان سے اٹھتا تھا زور  
بنامیں نے ایک ریختے کا محل  
وہاں آن کر تیسر کیا لے گیا  
عقب میں چپ و راست پانی کا زور  
اگر دائیں بائیں طرف یہ پھرا  
بھلا کون سی پاسکے گا یہ گھاٹ  
ادھر منتظر ہیں نہنگِ نظر  
بچا ان بلاؤں سے یہ ذوقِ فنون  
نہ منہ پھیرنے کی اسے تاب ہے  
کہ راہ گریز اس پہ سر بستہ ہے  
مگر پھیر کر منہ کرے مجھ پہ چوٹ  
مجھے یاد ہیں اُس عزیمت کی قسم  
نگاہیں ہیں دو چشم کی دو، ولیک  
نگاہوں کی پھر میں چلا کر کند  
کندوں کے گر پھنس گیا تار میں  
وہ مینار جب تک رہے برقرار  
کہ پھر کوئی مضمون نہ سرزد کرے

دو آب جہاں میں یہ مشہور تھا  
تلاطم میں پڑتا تھا دریا سے شور  
لکھی در پر اُس کے یہ ضرب المثل  
وہی تازہ مضمون پُجرا لے گیا  
کہاں جائے گا یہ دو آبے کا چور  
کیا فرض دریا میں جا کر گرا  
نظر بھی تو آتا نہیں اس کا پاٹ  
نگہ کے ادھر سونس گاڑے ہیں سر  
تو پھر مردم آب ماریں گے کون  
نہ کچھ آگے بڑھنے کا اسباب ہے  
دو آب بھی آگے سے پیوستہ ہے  
بنے سحر سے انڈھا لوٹ پوٹ  
کہ کہتے ہیں جن کو کلیدِ طلسم  
جہاں گھر سے باہر گئیں، یہ پھر ایک  
پلک مارتے اس کو کرتا ہوں بند  
چنوں ہجو کے اس کو مینار میں  
رہے میری سارق کشی یا دگار  
نہ نیت، پرانے سخن پر دھرے



جو گزرے ادھر سے کوئی راہ گیر  
 کہے آ کے نزدیک مینا میر  
 یہ مینا بدذو بد افعال ہے  
 جو چوری کرے، اُس کا یہ حال ہے  
 بقا جب یہ قصہ ہوا سب تمام  
 دھرا میں نے "مینا میر" اس کا نام

### بجوا یضاً

ہم نہ کہتے تھے تمہیں اے دوستاں  
 کھائے اور گھر کے جو ہر مہیموں سرشت  
 قصہ اژدر رہا بالائے طاق  
 یعنی اس نے سن کے بجو تازہ کی  
 تیر ہے یا نطفہ شیطاں ہے یہ  
 گو کہ پہلے شاعروں میں پیکھنا  
 گر چھڑایا چاہو اپنی اپنی گند  
 در نہ ہے یہ فکر میں ہر ایک کی  
 کل پڑا تھا جا یہ اک شاعر کے سر  
 اس کے جی کی لگ رہا تھا تاک میں  
 تیر کے جو ہدم و ہم ذات ہیں  
 گر کوئی ہوتا نقیب الشاعریں  
 دوستی بندر کی ہے جی کا زیاں  
 تا ابد جائے نہ اُس کی خورے زشت  
 تازہ اک اشک ہوئی ہے اتفاق  
 پوچھ کوئی اپنی پر آوازہ کی  
 اس قدر جو در پے انساں ہے یہ  
 کر لگا اس کو تاشا دیکھنا کہ  
 اس کو جلدی سے کرو شیشے میں بند  
 اپنی جا کر لے گا انگلی نیک کی  
 دو ہیں ہر کاروں نے مجھ کو دی خبر  
 گر نہ جا دیتا میں دھونی ناک میں  
 وہ بھی سب از عالم جنات ہیں  
 یہ منادی پھیرتا میں ہر کہیں  
 جا جا بھلے ہیں گھٹنے ان دونوں



اٹھ کے کل میں مسجد جامع گیا  
 چاؤڑی کی شہدیاں کھیلے ہیں پیر  
 ایسے بھگتنے سے جو تم نے بچھیر کی  
 یاد آئی ہے مجھے اک طرف نقتل  
 آئے کل گھر میرے اک مخلص قدیم  
 دم چڑھا، چھاتی دھڑکتی، پہرہ زرد  
 آہ مردم کہ کے، اک کھائی بچھاڑ  
 جب ہوئی اُن کو افاقت بیش و کم  
 جا سے اٹھ بیٹھے، ہوئے گرم سخن  
 کاے محبت صادق الاخلاص من  
 کیتکی نامی، مری ہے اک کنیز  
 اُس پہ اک بھگتنا ہوا دل باختہ  
 اٹھ کے جب وہ آسیا گرداں کرے  
 دن بدن جھرنے لگی وہ ماہ چہرہ  
 جان من سچ کہ تجھے کیا درد ہے  
 سرگذشت حال جب اُس نے کہی  
 مصلحت دی میں کہ اے نیکو سرشت  
 آج وہ آئے، تو تو مت کیجو شرم  
 بیٹھ جاوے گا جو وہ اُس پر کبھو  
 مصلحت میری غرض آنی تھی راست  
 بیٹھ کر چکی لگی وہ پیسنے

واں تماشا اور ہی دیکھا نیا  
 ہے زباں زد خلق کے آئے ہیں تیر  
 جوتیاں سلوا لو دو دوسیر کی  
 جس کے سُننے سے پڑے حیرت میں عقل  
 دل غم و اندوہ سے اُن کا دو نیم  
 ہونٹھ سوکھے، چشم تر، گردے میں درد  
 مفت میں جی کو لگا تب میرے جھاڑ  
 آئی کچھ اعضا میں طاقت بیش و کم  
 سب کیے اپنے بیاں رنج و عن  
 مخلصے از دوستانِ حنا ص من  
 با سلیقہ، خوش ہنر، صاحب تمیز  
 رات کو آنے لگا بے ساختہ  
 تب وہ ملعون آ، اُسے حیراں کسے  
 میں نے پوچھا ایک دن از دے ہر  
 ایسا کیا غم ہے تجھے، کیوں زرد ہے  
 مجھ میں کچھ طاقت نہ سُننے کی رہی  
 گرم کر رکھ آج اک چوٹے میں خشت  
 بیٹھنے کو دیجو اُس کے خشت گرم  
 پھر تماشا دیکھو قدرت کا تو  
 رہ گیا جب شب سے باقی ایک پاس  
 آہی گھیرا اُس کو اُس ابلیس نے



مصلحت میں نے جو دے رکھی تھی کل  
 خشت پر جا ہی وہ بیٹھا کود کے  
 یک بہ یک اُس جا سے وہ بھاگا اچھل  
 واہ بی بی کیتکی، تم زور ہو  
 تھا کمیں میں میں بھی بالائے پلنگ  
 کر کے ریل پیل میں جاں بازیاں  
 لیکن اُس کی خوب لگتی تھیں چپات  
 جب وہ میرے مارتا تھا تن کے مشت  
 جی بچا کر میں نے لی راہ گریز  
 آپ تک پہنچا تو ہوں میں دوڑ دھوپ  
 اُن سے جب یہ ماجرا میں نے سنا  
 تلخ مجھ پر ہو گیا اُس وقت عیش  
 دیکھتا کیا ہوں کہ تیرا ستادہ ہیں  
 آپ پر پہلے پڑھا میں نے حصار

کر بقا اس بات کا یاروں میں ذکر  
 تاکریں جلدی وہ اپنی اپنی منکر

تیر نے تو ترا مضمون دو آ بے کالیا  
 یا خدا، تیر کے دیدوں کو دو آ بے کر ڈے

پر بقا تو یہ دعا کر جو دعا دینی ہو  
 اور بینی یہ بہا اُس کی کہ تربینی ہو



ڈرتا ہوں گرگسوں کا نہ ہو میرا شستہ  
 دیکھو تو کس طرح سے کھلاتا ہے پھلیاں  
 وہقان تھا، توشیح سے سید یہ کیوں ہوا  
 یکچند تار ہے ورقِ دہر پر بفتا  
 رنڈی کا سوکھ سا کھ بنا ہے گماشتہ  
 صید انگناں ہے ہے بصد گداشتہ  
 تو ام زمیں میں گرنہ ہوا تخم کاشت  
 کر ایسی ہجو آبِ طلا سے نگاشت

میر صاحب! پھر اس سے کیا بہتر  
 لے کے دیواں پکارتے پھرے  
 اس میں ہووے جو نام شاعر کا  
 ہر گلی کو چے "کام شاعر کا"

یکچند میر جی نے ہم کو لگا کے لہے  
 ہم کو یہ تھا بھروسا شاہوں کے ہیں یہ...  
 آخر کو میر اپنے مضمون کے دزد ٹھہرے  
 پھیکے کیے ہمارے جتنے تھے شعر گہرے  
 چوروں کے پاسباں سے ہوتے ہیں...  
 سنتے کہیں نہ ہوویں، شیطان کے کان بہرے

### ہجو مرزا و میر

مرزا و میر باہم دونوں تھے نیم ملا  
 اس واسطے بقا اب ہجووں کی رسیاں سے  
 فنِ سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھو  
 دونوں کو باندھ باہم میں نے کیا ہے پو

عیب ہے گرچہ کثرتِ یک لفظ  
 سخنِ فارسی سے تا ہند

لے ن۔ : مرزا و میر دونوں باہم تھے نیم ملا۔

لے آ، مر: میر و مرزا کی شعر خوانی نے  
 کھول دیوان دونوں صاحب کے  
 کچھ نہ پایا سوا اس کے سخن  
 بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی  
 اے بقا ہم نے جب زیارت کی  
 ایک تو تو کہے ہے، اک ہی ہی



برحسبِ اہے تمام عالم سے  
یعنی واں لفظ "تو" ہے پُر کن شعر  
کھول دیوان دونوں صاحب کے  
شعر سودا و مسیر کے دیکھے  
طویرِ سودا و وضعِ مسیر تفرقی  
"ہی" سے ہے یاں کلام کی بھرتی  
اسے بقا ہم نے جب زیارت کی  
وہ تو "تو تو" کریں ہیں، یہ "ہی ہی"

سرسرایاں چوں کنم سر ریختہ سر ریختہ  
راے زرخواہ شعر ہجو زرخان کجاست (کذا)  
کی رسد شیرینی شعر مرا شعر عدو  
شعر تلخ تلخ گویان ہست ہجو تلخ تلخ  
ورسخن طلبی، سوادِ شعر سودا را مخر  
زانکہ آن بی سود سودا سادہ لوح بیسواد  
آن خفیف العقل بہر خفت از بس درد و لفظ  
در روانی میکند چوں میش در ہر گام صوت  
شعر پُر مضمون ہی خواہد پر و بال بقا  
سازد ارہر شاعر پر ریختہ پر ریختہ  
در جب پر در کنم در ریختہ در ریختہ  
تا بگویم از زباں زدر ریختہ زدر ریختہ  
من شکر افشاندنم، او گھر ریختہ گھر ریختہ  
مرہ بر مریاں مر ریختہ مر ریختہ  
آخرش چوں می خرمی خرم ریختہ خرم ریختہ  
بر امید با ..... بر ریختہ بر ریختہ  
طرح از عطف بیاں ار ریختہ ار ریختہ  
ہجو جہم موزہا چہ ریختہ چہ ریختہ

### ہجو دہقاں

میں پوچھا ایک دہقاں سے کہ بھائی  
کہا ہم آج تو بھل جی حلاوا  
رسوئی آج تم نے کیا پکائی  
یلی بھرتیل دُکری کا منگاوا



تنک لے اُہتے ہم بھتی بجھاری  
 تنک لے اُہتے کانن میں چواوا  
 تنک لے اُہتے اُٹن منہ کاکیتا  
 تنک لے اُہتے دیوا گھسکا بالا  
 تنک مانجا تلنتی میں پڑا ہے  
 سو وا کو کال کے بینی دھرا ہے دکھ  
 مر۔ بھر دیں تو کل بھتی پکی  
 بجھریے او چنا کی لے اکھسی (کھڑا)

---

ایک ملکی نے کہا قاضی سے 'جب ہم نہ لے  
 خاضی خضباتی ہی خصبے میں ترے ڈولیں گے  
 کی گرفت اُس نے جو خے پر، تو لگایوں کہنے  
 قوب قاطر سے تری قاف ہی اب بولیں گے







فارسی کلام







یار با جور و جفا بوده سلامت باشد  
بت خور چهره، کز و در تب و تابیم، برو  
خلق در عهد لبث چون نتواند مردن  
کا حم آن لب بزین داد، کنون حاجت نیست  
گمراهی پیریم گشت، کنون حضرت خضر  
آب تیغست که چو آب خضرم جان بخش است  
گو که دجال و شان غول خوانند، چه غم (کذا)  
ما بمرسیم، لبث بهر رقبیان چون خضر  
خضر را هم بنگه گشته خود ساز، که او

خود همکید و نمکاید لب خود به بفتا

مانی اکنون به بقا بوده سلامت باشد (کذا)

هر تیر غمزه ات زدلم بر نشان رسید  
دیدیم بچهره یک دوسه اشکست پیش پیش  
بر ذات خود ز خون دلم رزق تنگ بود  
تا دامن از دهن سگ کوی او کشتم  
الفت نگر که آن سگ کو بعد رحلتم  
ناورده تاب ضبط، فغان جست چون سپند  
معلوم جای ماه زمین سیر خود کنم  
آواز پای اوست بقا آشنای گوشش

تیر یک شد خطا زدلی من، بجان رسید  
تا غور چشم تر بکنم کاروان رسید  
اینک غمت بخانه من میهمان رسید  
حاجب بقصد حبیب از آن آستان رسید  
بو کرده کرده تا بسراستخوان رسید  
از بجز درون من و درد بان رسید  
دیگر اگر بود بفلک میتوان رسید  
گر بشنوم ز دور، بگویم فلان رسید



## تنافرا از جاہل

شبی با بقا گفتم ای نابجوی	جوان خردمند و پاکیزه خوی
ترا با چنین عقل و تدبیر و هوش	چسان گفته، نفس آید بگوش
همانا که ادگفت، سازی قبول	نداری سر موز حکمش عدول
باغوا ای ابلیس نادان فریب	دل خویش تا کی نهی در نهیب
مشو در کف نفس جاہل اسیر	اگر بچنین است، پیشین بمیر
ترا اژدها گر بود یار غار	ازان به که جاہل بود غمگسار

## مثنوی

مرد در پی عیب جو یان حنام	ببر عیب پوشی ز آئینه وام
ازان مس بس گردد ز در بر زار	که همزنگ هرگز ندارد ضرر
چو معیوب بیند شود عیب دار	که از خود بگرداندش شمار
وگر بلهوس را بیفتد بدست	نماید همان جلوه او را که هست
بروزش بود چهره دلفروز	که بیند در و چهره خویش روز
شبانگاه گردد ازان تیره رو	که شب روی خود را نبیند درو
ز زشتی نگویی گرت زشت گفت	نکویش ز نیکان بیاید شگفت

ندانم بقا را ز آئینه کم  
که روشن دل و سینه صافست هم



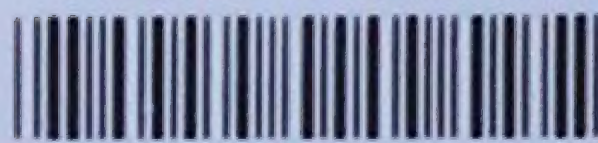
## رباعی

تا دیده بود، ز دست دیدن ندانم  
باوید تو جان ز تن رسیدن ندانم  
تا هست هر استخوان من حامل گوشت  
من کارد با استخوان رسیدن ندانم

میخواست بقاشام و سحر از پی نام  
کاغذ کلام را رساند به تمام  
بیار بگفت و گفته انجام نیافت  
پس کرد کلام ختم شد ختم کلام



ALLAMA IQBAL LIBRARY



98494

K UNIVERSITY LIB.

Acc No. 98494

Date 12-2-73









**ALLAMA  
IQBAL LIBRARY  
UNIVERSITY OF KASHMIR  
HELP TO KEEP THIS BOOK  
FRESH AND CLEAN.**